

DELHI UNIVERSITY
LIBRARY

DELHI UNIVERSITY LIBRARY

Cl. No. O111,3L95x 168N40

7.0.76

Ac. No. 311233

Date of release for loan

This book should be returned on or before the date last stamped below. An overdue charge of 5 Paise will be collected for each day the book is kept overtime.

انگلستان کے رنگین نواشاعر

جان کیٹس کے تین رومان پرور افسانے

اندھا دیوتا

مترجمان

میرزا ادیب بی۔اے (آنرز)

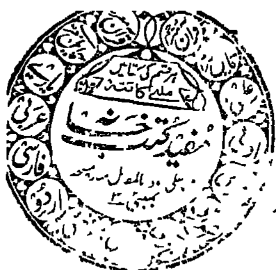
عبدالرحیم شبلی بی۔ کام

احسان علی شاہ بی۔اے

اُردو اکیڈمی۔ لاہور

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

فہرست



پیش لفظ

جان کیٹس کے روح نواز منظوم افسانوں کے اس مجموعہ کو اردو کے باذوق قارئین کے سامنے پیش کرتے وقت مجھے غالباً کسی اعتذار کی ضرورت نہیں۔ انگلستان کے اس مایہ ناز شاعر کے ہر ہر لفظ میں موسیقی اور شعریت انگڑائیاں لے رہی ہے۔ اور اس کی نظمیں پڑھتے وقت انسان یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ قدوسیوں کے دوش پر سوار ہو کر قوس قزح کی جھلملیوں سے گزرتا ہوا زہرہ و ناہید کی رنگین فضاؤں میں تحلیل ہو رہا ہے۔ جب میں کالج میں "منازل سلوک" طے کر رہا تھا، تو مجھے اس کے تین منظوم افسانے خاص طور پر پسند آئے اور میرا جی چاہا کہ انہیں اردو زبان میں منتقل کروں۔ لیکن کسی نہ کسی وجہ سے میں اس ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ آخر جون ۱۹۳۹ء میں ادب لطیف کے "افسانہ نمبر" کے لئے میں نے اناابیلا کا "جام زر تاب" کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ جو اہل ذوق نے بے حد پسند کیا۔ خوش قسمتی سے "لیمیہ" کا ترجمہ میرے عزیز دوست جناب شبلی بی۔ کام کر چکے تھے۔ میں نے ان کے سامنے تجویز پیش کی کہ جان کیٹس کی کم سے کم تین منظومات کا اردو میں ترجمہ کیا جائے جس کو انہوں نے نہایت حوصلہ افزا طریقے سے پسند کیا۔

چنانچہ دی ایو آف سینٹ اگنیز کا ترجمہ اپنے دوسرے عزیز دوست جناب میرزا

ادیب بی اے سے کرایا۔ اور اب ان تینوں حسین و جمیل افسانوں کا مجموعہ قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ اُمید ہے وہ بھی اسے پسند کریں گے۔

یہ کتاب جہاں میرے دیرینہ خوابوں کی تعبیر ہے۔ وہاں مجھے فخر ہے کہ یہ ہم تینوں دوستوں کی دوستی اور دلی رفاقت پر خلوص و وفا کی ایک مُہر بھی ہے۔ میرزا ادیب اور شبلی بی کام ملک کے ممتاز ترین ادیب، تجربہ کار صحافی اور مشاق مترجم ہیں۔ اُن کی رفاقت اور امداد میرے لئے موجب فخر اور سرمایۂ ابتہاج ہے۔ دراصل یہی دو نام اس مجموعہ کی کامیابی کے ضامن ہیں۔

کتاب کی ظاہری تزئین و ترتیب کے لئے اردو اکیڈیمی پنجاب لاہور کے بیدار مغز میاں محمد حنیف صاحب کا بے حد ممنون ہوں۔ اگر اُن کا جذبۂ شوق شاملِ حال نہ ہوتا تو اس کتاب کا جلد از جلد مطلعِ اشاعت پر جلوہ گر ہونا قریباً ناممکن تھا۔

میاں بلس اپنا مافی الضمیر ادا کرتے وقت بعض اوقات نہایت دقت پسند ہو جاتا ہے۔ اور یونانی تلمیحات کے بکثرت استعمال نے تو اُسے پُر اسرار شاعر بنا دیا ہے۔ تاہم اُس کی نظموں کو ترجمہ کرنے میں ہم تینوں نے انتہائی کاوش سے کام لیا ہے۔ اور ایک دوسرے کے مشورے سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود اگر دقیقہ بین حضرات پروپرائٹر اردو اکیڈیمی لاہور کے ذریعے سے مجھے کسی خامی کی طرف توجہ دلائیں۔ تو اگلے ایڈیشن میں اُس کی ضرور اصلاح کر دی جائے گی۔ الغرض ناقدانہ مشوروں کا بسر و چشم خیر مقدم کروں گا۔

لاہور

۱۵ جنوری سنہ ۱۹۷۴ء

احسان علی شاہ

جان کیٹس

انگریزی ادب کے عہدِ رومانیت کا بلند مرتبت شاعر جان کیٹس انتیس یا اکتیس اکتوبر ۱۷۹۵ء بمقام مورفیلڈ لندن پیدا ہوا۔ اس کا باپ پہلے ایک سرائے کے مالک کے یہاں ہوسٹلر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ بعد ازاں اس نے اپنے مالک کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اور خسر کی وفات کے بعد سرائے کا مالک بن گیا۔ اس طرح جان کیٹس کی تعلیم و تربیت کے لئے حالات ساز گار ہو گئے۔

آٹھ برس کی عمر میں جان کیٹس کو این فیلڈ کے ایک مقامی مدرسے میں بھیج دیا گیا۔ یہ مدرسہ ریورینڈ کلارک کے زیرِ اہتمام جاری تھا۔ جان کیٹس بظاہر ایسا ذہین معلوم تو نہیں ہوتا تھا۔ تاہم اس کی گفتگو اور نشست و برخاست کے طور طریقے میں کچھ ایسی کشش تھی کہ مہتمم مذکور کے بڑے لڑکے کو اس سے کچھ اُنس سا ہو گیا۔ اور وہ ہر وقت اسے اپنے قریب رکھنے لگا۔

اسکول میں داخل ہوتے وقت کیٹس کا علمی ذوق اتنا بلند نہ تھا۔ لیکن کلارک کی صحبت نے آہستہ آہستہ اسے کتب بینی کی طرف مائل کر لیا۔ اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ کیٹس کو پڑھنے کا جنون سا ہو گیا۔ اسکول کی لائبریری میں تاریخ، سفرنامے اور جغرافیہ کی کتابیں موجود تھیں۔ کیٹس نے بہت جلد ان کتابوں کو پڑھ لیا۔

اس اثنا میں اس کا باپ مر گیا۔ اور اس کی ماں نے چند ماہ کے بعد دوسری شادی کر لی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کیٹس کو تعلیم بند کر دینا پڑی۔ اب وہ ایسی تعلیم حاصل کرنی چاہتا تھا جو اس کی آئندہ زندگی کے لئے اکل و شرب کی ضامن ہو سکے۔ لہذا پندرہ برس کی عمر میں اس نے اپنے پرانے مدرسے کو الوداع کہا۔ اور مسٹر ہیمونڈ کے دارالجراحی میں ایک شاگرد کی حیثیت سے داخل ہو گیا۔

اس غیر شاعرانہ ماحول کے باوجود کیٹس کا ادبی ذوق بدستور رہا۔ اور وہ اپنے پرانے اسکول میں جو دارالجراحی سے قریب ہی تھا۔ وقتاً فوقتاً جاتا رہا۔ اس زمانے میں سپنسر اور الزبتھ کے عہد کی شاعری نے جان کیٹس کی تمام تر توجہ کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ وہ حیران ہو کر شیکسپیئر اور اس کے معاصرین کے بے باک تخیل کو دیکھتا اور جس استادانہ مہارت سے وہ الفاظ کو توڑ موڑ کر اپنا لیتے تھے۔ دیکھ دیکھ کر جھوم جھوم جاتا۔ اسی زمانے میں اسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ خود ایک شاعر ہو سکتا ہے۔ اس احساس نے کیٹس کو بہت جلد حلقۂ احباب میں ایک شاعر کی حیثیت سے ہر دلعزیز بنا دیا۔

کیٹس کی شاعرانہ طبیعت بہت جلد دارالجراحی سے دست بردار ہونا پڑا اور وہ لندن میں طب سیکھنے کے لئے چلا گیا۔ لیکن یہ پیشہ اور شاعرانہ طبیعت! بھلا ان متضاد مشاغل کا باہم مل جانا کس طرح ممکن ہو سکتا تھا۔ جان کیٹس جلد ہی اس سے بھی گھبرا گیا۔ اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شاعری ہی کا ہو رہا۔

کیٹس کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۸۱۷ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ گو مستقبل کے ایک عظیم المرتبت شاعر کا کلام تھا تاہم نومشقی کی تمام خامیاں اس میں موجود تھیں۔ مزید براں اُس

وقت تک شیلے اور کولرج رومانیت کے بہترین شہ پارے پیش کر چکے تھے۔ اس لئے اس مجموعہ کو کسی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ بلکہ اس پر سخت ترین تنقید یں ہوئیں۔ اور اخباروں نے اس کے خلاف اتنا شور مچایا کہ کیٹس کو سخت صدمہ ہوا۔ لیکن خوش قسمتی سے اُسے اس وقت ایک ہمدرد دوست مل گیا جس نے اُسے شیلے سے روشناس کرایا۔ اور اس کے کلام پر ہمت افروز تبصرہ بھی ایک پرچے میں شائع کر دیا۔

اس کتاب کی اشاعت کے دوسرے سال ایک دوسرا مجموعہ شائع کیا گیا۔ جو باوجودیکہ پہلی کوشش سے بہت زیادہ کامیاب تھا۔ اور جس میں کیٹس کی غیر معمولی ذہانت آہستہ آہستہ پروبال نکالتی نظر آتی تھی۔ تاہم عوام نے اسے بھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔ "بلیک ورڈ میگزین" اور "کوارٹرلی ریویو" میں اس پر سخت تنقیدیں کی گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جو شاعری کی صحیح روح کو سمجھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے تھے کیٹس کے مخالف ہو گئے۔ اور اس پر چاروں طرف سے آوازے کسے جانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات جب کیٹس کہیں سے گذرتا تو لوگ اس کو "یہ بھی شاعر ہے" کہہ کر دق کیا کرتے۔

یہ درست ہے کہ اس بے پناہ مخالفت نے کیٹس کے احساسات پر ایک زبردست ضرب لگائی۔ لیکن کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ یہی مخالفت اس کی جان لیوا ثابت ہوئی میرے خیال میں کیٹس اتنا بزدل نہیں ہو سکتا کہ محض مخالفت سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں۔ میرے اس نظریے کی دلیل یہ ہے کہ اگر کیٹس نے حقیقتاً اس مخالفت کو اتنی وقعت دی ہوتی تو اُس کا تیسرا مجموعۂ کلام ہرگز اتنا بلند پایہ نہ ہوتا کہ وہ یک دم ایک معمولی

شاعر کی حیثیت سے اچھل کر انگریزی ادب کے بہترین شعراء کی صف میں آ کھڑا ہونا یہ محض شیلے کی شاعرانہ تعلّی ہے۔ جس نے کیٹس کی موت کی سب سے بڑی وجہ مخالف تنقیدوں کو قرار دیا۔ اور کتنی بڑی غلطی ہے کہ ایک محبت کرنے والے دوست کے متعصّب اظہارِ غضب کو تاریخی حقیقت سمجھ لیا گیا ہے۔

بہر حال کیٹس کے ان دو مجموعوں کو بڑی سختی سے دبانے کی کوشش کی گئی۔ اور مخالفوں نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی کہ کیٹس کو انگریزی ادب میں قدم رکھنے کی جگہ نہ ملے۔ لیکن وہ جوہر جو قدرت کی طرف سے کسی شخص کو مرحمت ہوتا ہے۔ اپنا خراج لئے بغیر ضائع نہیں ہو سکتا۔ قدرت نے کیٹس کو شاعر بنا کر دنیا میں بھیجا تھا۔ اُسے شاعر بننا تھا اور اس کے سامنے اس کے تمام مخالفین کے سر جھکنے تھے۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا اور ۱۸۱۸ء کا وسطی زمانہ کیٹس کی شاعری کے لئے ایک نئی زندگی لے کر آیا۔

۱۸۱۹ء اور ۱۸۲۰ء کے درمیانی زمانے میں کیٹس کی شاعری معراج پر تھی۔ اس زمانے میں اس نے ہائپیرین، لیمیا، دی ایو آف سینٹ ایگنز جیسی لافانی نظمیں کہیں اور اسی زمانے میں وہ سانیٹ بھی کہے جو کیٹس کو شیکسپیئر کے پہلو میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ کیٹس کی زندگی کا بیک وقت رنگین اور قاتل دور شروع ہوا۔ اگست ۱۸۱۹ء میں وہ ایک آوارہ مزاج لڑکی فینی براؤننگ سے پہلی مرتبہ ملا اور بہت جلد اس چنچل حسینہ کے عشق نے کیٹس کی ساری روح کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ لیکن یہ لڑکی اس عظیم الشان شخصیت کے نازک دل کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اُس نے اُسے رُلا رُلا کر اور تڑپا تڑپا کر مارا۔ اس کے ساتھ ہی تپ دق کا مہلک عارضہ بھی جڑ پکڑنے لگا۔ اور آخر ناکامیٔ محبت کے شدید غم اور بیماری کے مہلک اثرات نے کیٹس کی شاعرانہ قوتوں کو

سلب کر لیا۔ دُنیا ایک دوسرے شیکسپئیر کی تخیل آفرینیوں سے محروم کر دی گئی۔
۱۸۲۰ء میں خون تھوکنے کا شدید دورہ پڑا۔ اور کیٹس کو یقین کرنا پڑا۔ کہ اس کی زندگی ختم ہونے کو آئی ہے۔ جب دورے کا اثر قدرے کم ہوا تو اس نے ہوا بدلنے اور اپنے متلاطم جذبات کو سکون پہنچانے کے لئے سفر کا ارادہ کیا۔ اور نیپلز کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں سے ہوتا ہوا یونان پہنچا۔ ابھی یونان میں مقیم ہوئے ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ خون کا دوسرا دورہ پڑا۔ اور کیٹس کمزور ہوتا گیا۔ آخر ۲۴ سال کی عمر میں حُسن کا یہ سچا پجاری اور دُنیا کا عظیم الشان شاعر داعئ اجل کو لبیک کہہ گیا۔

کیٹس کی شاعری پر ایک اجمالی نظر

مجموعی حیثیت سے کیٹس کی شاعری ایک ایسے غیر معمولی ذہین شخص کی اختراعی کوششوں کا نمونہ ہے۔ جو اپنے تخیل کے لئے سماجی اور وقتی ہنگاموں سے بےخبر بے نیاز فضا پیدا کرنا چاہتا ہو۔ نیچر کے جمالیاتی پہلو کو صنعیانی رنگ میں رنگ دے اور پھر اس فضا میں جو خیالات و افکار پیدا ہوں۔ انہیں شاعرانہ اصول و ضوابط کے ساتھ پیش کرے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے کیٹس کی نمایاں خصوصیت اس کی جذباتی حس ہے۔ نیچر کا جمال دیکھ کر شاعر کے دل میں بے پناہ جذبات موجزن ہو جاتے ہیں۔ وہ خداداد تعمق نظر سے مناظر کے حُسن میں سے معیاری خوبیاں اخذ کر لیتا ہے۔ اور پھر ان تمام احساسات کو مترنم زبان میں قلمبند کر دیتا ہے۔ یہ کیٹس کی شاعری ہے۔!

اب اگر ہم اُس کی شاعری کے ارتقائی مراحل پر طائرانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ کیٹس تین مختلف مدارج میں سے ہو کر گذرا ہے۔

(۱) آغاز میں وہ ورڈز ورتھ کی فطرت پرستی سے بہت حد تک متاثر ہوا اور وہ بھی ورڈز ورتھ کی طرح قدرتی مناظر کو ایک حسن مستور کا نقاب تصور کرتا رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ اُسی زمانے کے آخری ایام میں ورڈز ورتھ کا یہ اثر زائل ہونے لگا۔ اور وہ عہد عتیق کے یونانی شعرا کا زیادہ مداح ہوتا گیا نتیجۃً نیچر پرستی کے نظریہ میں بھی انقلاب آنے لگا۔ اور کیٹس یونانی شعرا کی طرح نیچر کو بذات خود ایک قوت سمجھنے لگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ورڈز ورتھ کے نقطۂ خیال سے ہٹ کر اپنے لئے دوسری راہ نکالنا کیٹس کے لئے ایک طبعی مجبوری تھی۔ ایک مہلک بیماری کے جراثیم اس کے خون میں موجود تھے۔ اور وہ زندگی کو محض خیالات کا مجموعہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ زندگی میں کسی خاص سنسنی کا طالب تھا۔ ایسی سنسنی جو اس کی زندگی کو یکسر انہماک اور مسلسل خود فراموشی بنا دے۔

اس زمانے میں کیٹس کے ذہن میں بلند خیالات کا ایک ہجوم موجود تھا۔ لیکن ان خیالات کو یکجا کر کے اِن سے کوئی خاص نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت ابھی اس میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ تاہم اُسے اُمید تھی کہ جلد یا بدیر ان خیالات میں تسلسل قائم ہو جائے گا۔ اور وہ معیاری چیزیں پیش کر سکے گا۔ چنانچہ اپنی ایک نظم "نیند اور شاعری" میں جو اس کی پہلی کتاب کی آخری نظم ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "بہر حال میرے سامنے ہر وقت خیالات کا ایک بے پناہ سمندر موجیں مارتا رہتا ہے۔ اور میں اس میں آزادی

فکر کا تماشا کرتا ہوں۔ اور اسی میں مجھے شاعری کا منتہیٰ اور انجام نظر آتا ہے"۔

(۲) دوسرے دور میں یہی خیال جو پہلے پہل دھندلے نقوش کی طرح اس کے ذہن میں موجود تھا۔ آہستہ آہستہ شاعری میں علم الاصنام کو استعمال کرنے کی صورت میں متشکل ہونے لگا۔

ایلزبتھن عہد کے شعراء نے کیٹس کی اس دور کی شاعری پر خاص اثر کیا۔ وہ ان لوگوں کے تکلفاتِ شعری۔ بے باک تخیل۔ پرجوش طرزِ بیان اور اُس رندانہ جرأت کو بڑا پسند کرتا تھا جس سے یہ الفاظ کو موڑ توڑ کر اپنا لیتے تھے۔ کیٹس نے بھی ان کا تتبع کیا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

(۳) اس دور میں کیٹس کی شاعری اپنے معراج پر پہنچ چکی تھی۔ خیالات کا وہ بے پناہ سمندر جو اُسے اپنے سامنے ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا تھا۔ اب متشکل ہونا شروع ہوا۔ اس وقت تک کیٹس کو اظہارِ جذبات پر اتنی قدرت حاصل ہو چکی تھی کہ وہ اُس حُسن کو جو اس کے تخیل میں پیدا ہوتا تھا۔ ایسے خوبصورت الفاظ میں ملبوس کر دیتا کہ اُس کے بیان میں ایک تصویر کی سی حقیقت نظر آنے لگتی۔ اور یہی خصوصیت ہے جس نے کیٹس کو مصور شاعر بنا دیا۔

مسلسل تجربات نے کیٹس کو بتا دیا تھا کہ اس کا تخیل کس میدان میں آزادی کے ساتھ اپنا جوہر دکھا سکتا ہے۔ اس لئے اس نے ایسے موضوع تجویز کئے۔ جو بذاتِ خود (DESCRIPTIVE) ہیں۔ لیمیہ، ازابیلا۔ دی ایو آف سینٹ اگنیز میں اس کے طرزِ بیان اور خصوصیاتِ کلام کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ اصل افسانے کی طرف بہت ہی کم توجہ کرتا ہے۔ اور افسانے کی اُن تمام جزئیات کو جو حسین جذبات

انگیز اور تخیل کو بیدار کرنے والی ہوں۔ بیان کرنے میں اپنی ساری شاعرانہ قوتیں صرف کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے تمام افسانوں کے ہیرو۔ بے ہوش ہو جانے والے کمزور لوگ ہیں جن کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ لیکن حسین ازابیلا کا غم ایسے دردناک انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ کوئی متنفس اُس سے ہمدردی کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس زمانے میں کیٹس نے جتنے سانیٹ اور چھوٹی چھوٹی نظمیں کہی ہیں۔ ان میں سے بعض نہ صرف کیٹس ہی کے شاہکار ہیں بلکہ انگریزی زبان میں ان کا مثل ملنا مشکل ہے

حقیقت یہ ہے کہ کیٹس کی شاعری رومان و نغمات کی ایسی جنّت ہے۔ جس کی وادیوں میں پھرتے وقت انسان اس سے بہت بلند ہو کر ایک ایسی فضا میں سانس لینے لگتا ہے۔ جہاں دردمند کا ہر آنسو کائنات سے گراں اور مزدور کی ہر آہ ساری خدائی سے زیادہ قیمت رکھتی ہے۔

اندھا دیوتا

گردش غم رفیق درد انتظار کو ر
میرے نصیب میں اجڑے ہوئے ہی چمن ہوا
آنسو ہی بہے کیف ... تماشہ
کیا اٹھاؤں لطف میں کوئی بنا تھا

داغ

سانس جو سینے میں ہے خود یاد ہے
دل کی دنیا درد سے آباد ہے
خود کو بھولے ہیں بس اتنا یاد ہے
جو کیا تھا تم نے وعدہ یاد ہے
کھینچ آہ دل بیقرار رہنے دے
کہ تھوڑی دیر تو غم کی بہار رہنے دے
کر کے برباد اگر چھوڑ دینا تھا مجھے
نصیب تیرے ... سے اختلاج مجھے

نسیم کے حوصلوں کو بڑھانا پڑا
چھوٹی چوٹ پر مسکرانا پڑا
ہے پیچ و خم میں جیسے ڈگمگانا پڑا
ہر قدم پر مجھے سر جھکانا پڑا

میرزا ادیب بی اے (آنرز)

تعارف

دی ایوآف سینٹ ایگنیز (THE EVE OFST. AGNES) کیٹس کی پختہ کاری کے زمانے کا ایک عجیب و غریب شاہکار ہے۔ جو اس کی توصیفی (DESERIPTIVE) نظموں میں بہترین خیال کی جاتی ہے۔

اس نظم کا پلاٹ برٹن کی (ANOTOMY OF MELANCHOLY) سے لیا گیا ہے۔ برٹن کی کہانی ایک معمولی کہانی ہے۔ جو شاعرانہ تخیل اور زورِ بیان سے معرا ہونے کی وجہ سے بہت ہی غیر دلچسپ ہے۔ لیکن جب یہی مواد حُسن پرست اور محبت کے شیدائی کیٹس کے ہاتھ لگتا ہے تو وہ اس میں ایسی روح پھونک دیتا ہے کہ ساری کہانی بذاتِ خود ایک حسین شعر بن جاتی ہے۔

لفظوں ہی لفظوں میں ایک تصویر پیش کر دینے میں جو کمال کیٹس کو حاصل ہے وہ اُس زمانے کے اور کسی شاعر کو نہیں۔ اندھا دیونا کیٹس کے اس مخصوص طرزِ تحریر کا شاہکار ہے۔ نظم کے پہلے بند میں جن مترنم الفاظ میں اُس نے سردی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ وہ اسی کا حصّہ ہے۔ اور پھر جس خوبصورتی سے میڈیلاین کے کمرے کی ایک کھڑکی کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ حقیقتاً قابلِ داد ہے۔

سینٹ انگینز کے میلے کی شام! اُف! کس قدر سرد تھی۔ وہ شام الپائنے
پیڑوں کے لاتعداد پتوں کے باوجود شدتِ سرما سے ٹھٹھرا جاتا تھا۔ وحشی ہرن برف
پوش گھاس کے درمیان سہما اور کانپتا پھر رہا تھا۔ اور بھیڑیوں کا ریوڑ اونی لبادوں
میں مکمل سکون و سکوت سے لپٹا بیٹھا تھا۔ عابد کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر چلتے
وقت اکڑی سی جاتی تھیں۔ اور جب وہ مقدس مریم کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر دعا گنگناتا
تو اس کا گہرا سانس کسی پرانے بخوردان میں سے تقدس آب اور زعفرانی دھوئیں کی
طرح اُٹھ کر مقدس ماں کے قدموں سے لپٹتا ہوا عرش کی طرف اُڑ جاتا تھا۔

یہ عابد پاک نفس انسان دعا ختم کر چکا۔ دیا اٹھایا۔ خود اٹھا۔ اور افسردہ مضمحل
ننگے پاؤں۔ زرد رو گرجے کے بین الصفوف آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس چلا گیا۔
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اعرافی سلاخوں میں مقید مجسمے منجمد ہو گئے ہیں۔ وہ بہادروں
اور خواتین کے قریب سے گزرتا گیا جو خموشی کی بلاغت میں محوِ دعا تھے۔ اور جب اُسے خیال
آتا کہ کس طرح یہ بہادر برف زدہ خودوں اور زرہ بکتروں میں ٹھٹھر کر اکڑ جائیں گے
تو اس کی روح کانپ اُٹھتی۔

وہ ایک پہلو کے دروازے میں سے ہوتا ہوا شمال کی طرف گیا۔ اور ابھی
چند قدم ہی چلا تھا کہ موسیقی کی سنہری زبان نے اس غریب معمّر انسان کو آنسو بہانے
پر مجبور کر دیا۔ لیکن نہیں ــــــ اس کی موت کا حکم جاری ہو چکا ہے۔ اس کی طویل

عمر کی تمام مسرتیں ایک ایک کر کے ختم ہو چکی ہیں اور آج کی رات اس کے لئے مجسّم کفارہ بن کر آئی ہے۔ وہ ایک اور راستے پر چل دیا اور جلد ہی اپنی رُوح کو تسکین دینے کے لئے نا ملائم راکھ پر بیٹھ گیا۔ وہ تمام رات بیدار رہا۔ کیونکہ گنہگار کا کام ہی رونا ہے۔

اِدھر اُدھر جلدی میں آنے جانے سے دروازے کھُلے رہ گئے تھے۔ اس لئے معمّر عابد نے پہلے حسین اشعار سُن لئے جلد ہی نقرئی نفریوں کی صدا صدائے تہدید بن کر بلند ہوئی۔ درمیانی کمرے اپنی شوکت وتجمّل کے غرور کے ساتھ ہزاروں مہمانوں کا استقبال کرنے کے لئے بقعۂ نور بنے ہوئے تھے متحیّر نگاہوں کے فرشتوں کے مجسّموں جن کے سروں پر برف جمی ہوئی تھی۔ جن کے سر کے بال پیچھے کی طرف اُڑ رہے تھے۔ اور جن کے پر... سینے پر پلٹ گئے تھے۔ حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

بالآخر محفلِ سرور کے لاتعداد ارکان اپنے آپ کو کلغیوں، مرصّع کنٹھوں اور بیش قیمت ملبوسات سے سنوارے کمروں میں اس طرح آ گئے۔ جس طرح نوجوان دماغ میں جس کے پردوں پر پُرانے رومانوں کے مسرور اور نڈر بہادروں کا سکّہ بیٹھا ہو، ہزاروں دلفریب تمنّاؤں کے ساتھ تصوّر کی ایک ہی جست میں لرزنے لگتے ہیں۔ لیکن ہم ان سب کو چھوڑ کر اپنے خیال کی تمام قوتیں اُن میں سے ایک خاتون پر مرکوز کئے دیتے ہیں۔ جس نے سردیوں کا دن محبّت اور ریپوار سینٹ اگنیز کی شفقتوں کے متعلق سوچنے میں بسر کر دیا تھا۔

اُس نے کئی دفعہ بوڑھی عورتوں کی زبانی سُنا تھا کہ اگر ناکتخدا لڑکیاں سینٹ اگنیز کے میلے کی رات میں تمام رسوم پوری طرح ادا کریں۔ تو نصف شب کے سکز اوقت میں وہ سرور انگیز خواب دیکھیں گی۔ خواب میں ان کے بچھڑے ہوئے محبوب انہیں مل جائیں گے اپنی شیریں فانی محبت کا اظہار کریں گے۔ ایسی لڑکیاں جو خوب اپنے محبوب کو دیکھنا چاہیں،

انہیں چاہیئے کہ شام کے وقت کچھ کھائے بغیر ننگے پاسمین جسم کو سیدھا لٹا دیں۔ نہ کبھی طرف دیکھیں نہ ہی اُن کی نظریں بائیں کو اٹھیں اور نہ ہی دائیں کو۔ بلکہ آسمان کی نیلگوں پہنائیوں میں نگاہیں گاڑے خدائے قدوس سے اپنی تمناؤں کی تکمیل چاہیں۔

مقدّس میڈالین اسی وہم میں غرق تھی۔ اُس نے اس بلند آہنگ موسیقی کو بھی نہیں سُنا جو کسی ورد مند دیوتا کی پکار معلوم ہوتی تھی۔ اس کی بے باز ملکوتی نگاہیں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ لاتعداد انسانوں کو اپنے قریب سے گذرتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

—— اُس نے کوئی آواز نہیں سُنی۔ بہت سے خوبرو شہسوار پنجوں پر چلتے ہوئے اس کے قریب آتے لیکن بے نیل ومرام واپس لوٹ جاتے۔ اس کا دل برف کا ٹکڑا بن گیا تھا۔ نفرت سے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ کچھ دیکھتی ہی نہ تھی۔ اس کے خیالات کسی اور طرف تھے۔ وہ آج کی رات کے اُن حسین خوابوں کے لئے سرد آہیں بھر رہی تھی جو اس طویل سال کا بہترین حصہ ہوں گے۔

وہ —— بے نور آنکھوں کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر اضطراب تھرا رہا تھا۔ اور اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی۔ وہ مقدس وقت قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ غصے یا ہنسی کھیل کی بلند وکرخت آوازوں کے درمیان ٹھنڈی سانسیں بھرتی رہی۔ وہ محبت کرنا چاہتی تھی۔ نفرت اور طنز کی نگاہوں کو خواب شیریں کی ڈھالوں پر روکتی رہی۔

وہ ہر لمحے جانے کے لئے تیار ہوتی۔ لیکن پھر رُک جاتی۔ اس اثنا میں نوجوان پرفیرو اپنے دل میں میڈالین کی محبت کا طوفان آتش زبلئے، بیران جنگلات میں سے گذرتا ہوا آپہنچا وہ بڑے دروازے کے قریب الگ کر کھڑا ہو گیا اور تمام مقدس ولیوں سے دعا کرنے لگا

کہ اُسے ایک دفعہ میڈالین کو دیکھ لینے کی اجازت دے دی جائے۔ ان مضطرب ساعتوں میں صرف ایک لمحہ ایسا مل جائے جس میں وہ اُن تمام غیر مرئی قوتوں کی پرستش کر سکے، جو میڈالین کے لب و رخساروں میں سمٹ آئی ہیں۔ شاید وہ اس سے ہم کلام بھی ہو سکے۔ اس کے سامنے دو زانو ہو سکے۔ اس کے ملکوتی جسم کو چھو سکے۔ ایک بوسہ دے سکے —— آہ! یہ سب باتیں دنیا میں ہوتی رہی ہیں۔

وہ جرأت کر کے اندر چلا گیا۔ کاٹ ڈالو بدنامی کی زبان تاکہ ایک حرف بھی سنائی نہ دے سکے! پٹیاں باندھ دو ان تمام آنکھوں پر ورنہ اس کے دل میں —— محبت کے اُس نازک معبد میں —— ہزاروں پرچھائیاں اتر جائیں گی کیونکہ یہ کمرہ ایسے لوگوں سے بھرا ہوا ہے جو اس نوجوان کے حق میں بربریوں سے کم نہیں جن کی دشمنی ازلی ہے۔ یہ ایسے امرا ہیں جن کے کتے بھی اگر اسے دیکھ پائیں گے تو اس کے خاندان کی جڑوں کو نوچ کر رکھ دیں گے۔ انسانوں کے اس بھرے ہوئے کمرے میں کوئی دل ایسا نہیں جس میں اس کے لیے ہمدردی موجود ہو سوائے ایک ضعیفہ کے جس کی رُوح اُس کے رعشہ زدہ جسم کی طرح کمزور ہے۔

کتنی خوش نصیب تھی وہ گھڑی! بوڑھی خاتون ہاتھی دانت کے دستے والی چھڑی ہلاتی اُس طرف آ گئی جہاں وہ شمع کی روشنی سے بچ کر اور مسرت ریز آوازوں سے بہت پرے کمرے کے عظیم الجثہ ستون کے سائے میں سمٹا کھڑا تھا۔ اس نے بڑھیا کو چونکا دیا لیکن اُس نے جلد ہی اُس مانوس حسین چہرے کو پہچان لیا۔ حیرت زدہ ہو کر اپنی انگلیاں اپنے رعشہ زدہ ہاتھ میں بھینچ لیں۔ اپنے اوپر رحم کرو پرفیرو! بھاگ جاؤ یہاں سے۔ آج کی رات وہ سب یہاں جمع ہیں۔ اس خون آشام قوم کے سارے

افراد!

بھاگ جاؤ یہاں سے ــــــ بھاگو! وحشی، بدکردار برانڈ بھی یہیں پر ہے۔ اسے ابھی ابھی دورہ پڑا تھا۔ اور وہ اسی زبان میں تمہیں تمہاری قوم کو اور ہر چیز کو جس سے تمہارا کچھ بھی تعلق ہے بے نقط سنا رہا تھا۔ اور پھر یہاں بوڑھا فواسب مورس بھی ہے۔ جو اپنے سفید بالوں کے باوجود ویسا ہی وحشی اور ظالم ہے۔ اُف، میرے معبود۔ بھاگ جاؤ یہاں سے کسی مقصوت کی طرح گم ہو جاؤ ــــــ مقدس ولیو! یہاں نہیں، یہاں نہیں میرے ساتھ آؤ۔ ورنہ یہی پتھر تمہارا کفن بن جائیں گے۔"

وہ اُس کے پیچھے پیچھے ایک تنگ محراب تلے گذرتا گیا۔ اُس کی ٹوپی کا بلند پر چھت پر لگے ہوئے مکڑی کے جالے اتار رہا تھا۔ آخر جب بوڑھی خاتون نے ہلکی آواز میں کہا۔ اچھا ــــــ اچھا" تو وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گئے جس میں چاند کی سیم پاش شعاعیں سا نہر رہی تھیں۔ یہ کمرہ قبر کی طرح زرد بند سمہ وار رخامیدش تھا۔ اب مجھے بتاؤ کہ میڈ بایاہی کہاں ہے"۔ اس نے کہا۔ تمہیں قسم ہے اُس مقدس گرگھدر کی جس پر پرانے کھڈریاں سینٹ انگنیز کی بھیڑ ول کی اون بنتی ہیں۔ اور جوان کے سوا اور کسی کو نظر نہیں آسکتے۔ مجھے بتاؤ میرا وہ حسین خواب کہاں ہے؟"

"سینٹ انگنیز! آہ! آج سینٹ انگنیز کے میلے کی رات ہے۔ لیکن انسان مقدس دنوں میں بھی خون بہانے سے دریغ نہیں کرتے۔ اس خواہش کی تکمیل کا خیال کرنے سے پہلے تم ساحرہ کی چھلنی میں پانی بھر لو یا کوہ قاف کے تمام طلسمی غاروں کے حاکم اعلیٰ بنو۔ پر فیرو! میں تمہیں اس جگہ دیکھ کر دنگ رہ گئی ہوں۔ سینٹ انگنیز کے میلے کی رات ہے آج! خدا کے مقدس مدد فرمائے یہ کیسی ساحرانہ شعبدہ بازی ہے۔

میری حسین مالکہ کے محافظ فرشتوں نے شاید آج اسے دھوکا دیا ہے لیکن ٹھہرو! مجھے چند لمحوں کے لئے ہنس لینے دو۔ میری آئندہ زندگی کا ہر لمحہ میرے لئے آنسوؤں کے سمندر بہا رہا ہے!"

وہ ضعیف آواز میں بول رہی تھی۔ بیری پادریہ پرنیرو اس حیرت زدہ بچّے کی طرح اس کا منہ تکتا رہا جو آتش دان کے قریب بیٹھی عینک والی بوڑھی نانی کے ہاتھ میں پہیلیوں کی کتاب کو حیرت سے دیکھ رہا ہو۔ لیکن جلد ہی جب اس نے پرنیرو کو اس کی محبوبہ کے عزم سے مطلع کیا تو اس کی آنکھوں میں نورانی شعلے لپکنے لگے۔ اس سحر بار کے خیال نے جس کے نہاں خانۂ دل میں عہدِ طفلی کے نغمہ ہائے عشق کی گود میں سو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں کو محبت کے پاکیزہ موتیوں سے بھر دیا۔

دفعتہً ایک خیال گلاب کے پورے کھلے ہوئے پھول کی طرح آیا۔ اس کی پیشانی گلابی ہوگئی اور اس کے درد بھرے دل میں ایک میٹھی کسک پیدا کر گیا اور پھر اس نے دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک دینے کی ترکیب سوچی جس نے بوڑھی خاتون کو لرزہ براندام کر دیا "تم ایک ظالم اور کینہ توز فطرت کے انسان ہو۔ اس حسنِ مجسم کو عبادت کر کے سونے دو۔ اور اسے اجازت دو کہ وہ تم جیسے سیاہ قلب انسان سے بہت دور رہ کر اپنے محافظ فرشتوں کے پروں کے سائے تلے اپنے حسین خواب میں مشغول ہو جائے۔ جاؤ جاؤ! میں سمجھ گئی کہ تم وہ نہیں ہو جو تم دکھائی دیتے ہو!"

"میں سارے ولیوں کی قسم کھاتا ہوں کہ میں اسے کوئی نقصان نہ پہنچاؤں گا" پرونیرو نے کہا "اگر میں اس کی گھنگریالی زلفوں کا ایک بال بھی ادھر سے ادھر کر دوں۔ یا اس کے فرشتوں ایسے حسین اور معصوم چہرے پر جذبات کی آگ سے جلتی ہوئی نگاہوں

کی ایک نظر بھی ڈال دوں تو مجھے اُس وقت شفاعت نصیب نہ ہو جب میرے کانپتے ہوئے ہونٹ نحیف آواز میں آخری دفعہ اس کا نام پکاریں۔ اچھی انجیلا! میرے ان آنسوؤں پراعتنا در کھو۔ ورنہ میں ایک منٹ میں چیخ کر اپنے خوفناک دشمنوں کے کان کھڑے کر دوں گا۔ اور خواہ وہ وحشی بھیڑیوں سے بھی زیادہ خونخوار کیوں نہ ہوں میں اُن کی ڈاڑھیاں نوچ لوں گا۔"

"ہائے! آخر تم اس نازک دل کو خوف کے پنجوں میں دے دینے پر کیوں تل گئے ہو؟ ایک غریب، کمزور، رعشہ زدہ کلیسائی عورت کا دل جس کی آخری گھڑی شاید ابھی نصف شب میں آئے جس نے اپنی عمر کی کوئی صبح کوئی شام تمہارے حال میں دعا کئے بغیر نہیں گذاری۔"
ان الفاظ نے آتشِ عشق و غضب میں جلتے ہوئے پروفیرو کی زبان سے ملائم الفاظ نکلوائے۔ یہ الفاظ کس قدر دردانگیز تھے، کس قدر عمیق خلش کے آئینہ دار! یہاں تک کہ بڑھی انجیلا نے بھی وعدہ کر لیا کہ وہ جو کچھ کہے گا کرے گی۔ خواہ اس میں اس کے بوڑھے سر پر آفات کا پہاڑ کیوں نہ ٹوٹ پڑے۔
اس کی خواہش تھی کہ انجیلا اسے چھپا کر میڈیلاین کے کمرے تک لے جائے اور وہاں اسے کسی ایسے پوشیدہ کمرے میں چھپا دے۔ جہاں وہ اُس پاکیزہ حسن کو اس طرح چھپ کر دیکھ لے کہ کوئی دوسری آنکھ انہیں نہ دیکھ سکے۔ شاید وہ اس رات جبکہ لاتعداد پریوں کے جھرمٹ کمرے کی چادروں پر محو رقص ہوں گے۔ اور اس کی خمار آلود آنکھوں کے پپوٹے محبت کے جادو تلے جھکے ہوں گے وہ ایک بے مثال بیوی کا شوہر بن جائے۔ جب وقت سے مارلن نے شیطان کی چوکھٹ پر کریہہ ترین قربانی چڑھائی۔ اُس دن سے ایسی رات کے وقت کبھی کوئی عاشق و معشوق یک جا نہیں ہوئے۔
"جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔" بڑھیا نے کہا۔ "آج دعوت کی رات ہے۔

لذیذ ترین کھانے اور نفیس ترین شرابیں وہاں جمع ہوں گی تم کلیسا کی برساتی کے قریب
اس کا بانسری ایسا سراپا خود دیکھ لو گے۔ ایک لمحہ بھی ضائع مت کرو۔ کیونکہ میں بے
انتہا سست رفتار اور کمزور ہوں اور اپنے رعشہ زدہ سر کے ہاتھوں ایسا اہم فرض
تفویض نہیں کر سکتی۔ میرے پیچھے صبر سے میرا انتظار کرو۔ اس اثنا میں دو زانو ہو کر خدائے
قدوس کی درگاہ میں دعا کرو۔ تمہاری شادی اس خاتون سے ہو کر رہے گی۔ ورنہ خدا
حشر کے دن مجھے انسانوں میں سے نہ اٹھائے۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ اُس محبت کرنے والے کی کبھی نہ ختم ہونے والی گھڑیاں آہستہ آہستہ
گزرتی گئیں۔ آخر بوڑھی خاتون واپس آ گئی اور بڑی ہی دھیمی آواز میں اُسے اپنے
ساتھ چلنے کو کہا۔ اس کی آنکھیں رازداری کے خوف سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ آخر بہت
سے دھندلے راستے طے کرنے کے بعد وہ اس حسینہ کے کمرے میں پہنچ گئے۔ جس پر
چاروں طرف قیمتی ریشم کے پردے کھچے ہوئے تھے۔ اور جس کی خموشی بھی شفقت کی ایک ادا
معلوم ہوتی تھی۔ پرفیرو کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ چھپ کر ایک کونے میں ہو بیٹھا۔ اس
کی رہبر ذہنی کرب میں مبتلا تھی۔ اس لئے جلد ہی واپس چلی گئی۔

بوڑھی انگیلا اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سیڑھیاں ٹٹول رہی تھی۔ جب
سینٹ ایگنیز کی سحر زدہ دوشیزہ ——— میڈیلائن ——— ایک نئے صبر خوردہ کی طرح
ظاہر ہوئی۔ وہ سیمیں شمع دانوں کی ہلکی روشنی میں اضطراب سے قدم دھرتی چلی آ رہی تھی۔
اور بوڑھی سشنا سامنے چھپالیوں پر جا بیٹھی۔ نوجوان پرفیرو اُس بستر کو دیکھنے کے لئے
تیار ہو جاؤ۔ وہ آتی ہے ——— وہ پھر آتی ہے۔ ایک خوف زدہ فاختہ کی طرح!
جب وہ تیز قدم رکھتی ہوئی اندر آئی تو شمع بجھ گئی۔ دھوئیں کی نیلی سی لہر جاتا

کی زرد شعاعوں میں تحلیل ہو کر گم ہو گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اور ہانپنے لگی۔ وہ اس وقت انسان نہیں بلکہ باغِ عدن یا خوابِ زریں کی روح معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے کوئی ایسا لفظ نہیں سنا تھا جو اس کے لئے باعثِ آزار ہوتا۔ اور نہ ہی اُسے کسی قسم کا کوئی ڈر تھا۔ لیکن اس کا دل ـــــ اس کا دل پھیل رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نازک پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل جائے گا۔ گویا ایک ایسا بلبل جس کی زبان کاٹ دی گئی ہو گانے کے لئے اپنا گلا کھلا تا رہے۔ اور دم گھُٹ جانے کی وجہ سے اپنے پنجرے میں تڑپ کر دم توڑ دے۔

اس جگہ ایک بلند قامت کھڑکی تھی جس پر نہری محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ اس پر بیچ بیل پھل اور پتوں کے گچھوں کی تصاویر کھدی ہوئی تھیں۔ اور مختلف رنگوں کے شیشوں کے ٹکڑوں سے تتلی کے منقش پر سے مشابہ تھی۔ ہزاروں گھوڑوں۔ اولیاء اور دیگر دہ سے نقش ذخار کے درمیان نمایاں موجود تھا۔ جو ہزاروں بادشاہوں اور بادشاہزادیوں کے خون سے لالہ زار تھا۔

موسمِ سرما کا چاند اس کھڑکی پر اپنی پوری تابانیوں سے چمک رہا تھا۔ اور جب میڈیلائین خدا کی بارگاہ میں رحمت و نعمت کی بھیک مانگنے کے لئے جھکی تو اسی چاند کی ایک نحیف سی شعاع اس کے سینے پر کھیلنے لگی۔ اس کے آپس میں پیوست ہاتھوں پر گلابی رنگ جھلک رہا تھا۔ چاندی کی صلیب پر یاقوتِ جگری کا چھوٹا سا ٹکڑا دمک رہا تھا۔ اور اس کے بالوں پر کسی مقدس ولی کا سا جلال کھیل رہا تھا۔ وہ ایک پُرشوکت فرشتہ معلوم ہوتی تھی جو عرش کی طرف پرواز کرنے کو تیار تھا۔ پر پھر بےخودی کی حالت طاری ہو گئی۔ وہ مقدس، فضا کی حدوں سے پرے رہنے والی ہستی دوزانو ہو گئی۔

لیکن جلد ہی وہ ہوش میں آگیا۔ اس کی دعائیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنے بالوں سے بالقوتی ہار اتار لیے۔ اور ایک ایک کر کے تمام جواہرات بھی جسم سے علیحدہ کر دیے معطر لبادہ بھی اتار دیا۔ آہستہ آہستہ اس کا قیمتی لباس کھسکتا ہوا۔ اس کے گھٹنوں پر آ گیا۔ کسی سمندری حور کی طرح جس کا نصف جسم سمندری گھاس میں چھپا ہوا ہو۔ اس نے جاگتے میں خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ حسین سینٹ انگنیز اس کے بستر میں مصروفِ راحت ہے۔ لیکن اسے اپنی پشت کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مبادا یہ ہوشربا طلسم پاش پاش ہو جائے۔

آخر وہ کانپتی ہوئی بیدار ہونے کے باوجود بے ہوشی کے عالم میں اپنے نرم اور سرد گھونسلے میں لیٹ گئی۔ یہاں تک کہ نیند کی سکھ پاش حرارت نے اس کے تھکے ہوئے اعضا کو راحت کی گود میں لے لیا۔ اور رنج کی تکان رفع ہو گئی۔ وہ ایک خیال کی طرح رنج و راحت کی دنیا سے دور چلی گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کتابِ نماز کی طرح جو سیاہ فام بے دین پڑھا کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھلا ہوا گلاب دھوپ اور بارش سے بند ہو کر پھر غنچہ بن گیا ہے۔

اس فردوسِ نظر میں پہنچ کر پرفیرو مبہوت ہو گیا۔ اور اس کے کپڑوں کو دیکھتا رہا اس کے سانس کی آمد و شد کی دھیمی موسیقی کو سنتا رہا۔ شاید کوئی لمحہ ایسا بھی آئے۔ جب یہی سانس محبت کے لذت آفریں راگ میں بدل جائے۔ وہ لمحہ کتنا دلفریب ہو گا۔ وہ کمرے میں سے کوئی آواز پیدا کیے بغیر وسیع و عریض جنگل میں خوف کی حالت اس کمرے کے سکون زا قالین پر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ پردوں کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پردوں میں سے جھانک کر دیکھا ——— کتنی گہری نیند سو رہی تھی وہ!

چارپائی کے قریب جہاں چاند کی ایک چھوٹی سی شعاع دھندلی دھندلی روشنی بکھیر رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے ایک سبز رکھی۔ اور اس پر سُرخ رنگ کا مطلّا رومال بچھا دیا۔ شاید یہ کسی تعویذ کا اثر تھا کہ نصف رات کی بلند ہنگام قرنا اور ڈھول کی برانگیختہ کرنے والی آوازیں دُور سے اس کے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ کمرے کا دروازہ پھر بند ہوتا ہے۔ اور سارا شور وغوغا ختم ہو جاتا ہے۔

وہ اب بھی معطّر اور سفید ململ کی چادر اوڑھے لیٹی گہری نیند سو رہی تھی اندر پرفیروا اس کمرے میں سے سُرخ سیب بہی۔ آلوچہ اور بلائی آمیز دہی سے زیادہ نرم اور لذیذ شیر ینی۔ شہد نیز خوشبودار سربتوں سے بھری ہوئی تو بنیاں اٹھا لایا۔ اُس کے پاس ترکستان کا لہسن اور کھجوریں بھی تھیں۔ سمرقندی نیشیم اور البانوی زیتون غرض ہر لذیذ چیز اس کی جھولی میں موجود تھی۔

اُس نے ان تمام لذائذ کو طلائی تھالیوں اور سیمیں تاروں سے بنی ہوئی نفیس و خوبصورت ٹوکریوں میں سجا کر ایک جگہ رکھ دیا۔ جہاں یہ رنگ و بو کا حسین اجتماع رات کی خاموش فضا میں شان و وقار کے سر بند کئے کمرے کی خنک ہوا کو لطیف خوشبوؤں میں بسا تا رہا۔ میری محبت کے منتہا، میرے حسین فرشتے آنکھیں کھولو۔ تم میری جنت ہو اور میں تمہارا رب ہوں۔ تمہیں معصوم سینٹ انگنیز کی قسم یہ غفلت بائیں آنکھیں کھولو۔ ورنہ میرے دل کی بے پناہ دھڑکنیں مجھے تمہارے ساتھ ہمیشہ کے لئے سُلا دیں گی۔

یہ کہا اور اس کے گرم کانپتے ہوئے بازو میڈلاین کے تکئے میں دھنس گئے۔

دھندلائے ہوئے پردوں نے اس کے حسین خواب کو اپنے تاریک سائے میں لے

لیا۔ یہ سحرِ نیم شبی تھا جس کا پھل کر بیدار رہیں بدل جانا ایک یخ بستہ ندی کی طرح مشکل تھا۔
چاند ایک کشتی کی طرح چمک رہا تھا۔ اور چادر کا طلائی حاشیہ اُسی طرح اُبھر کشش کے
کے موجود تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کی آنکھوں کو کبھی بھی اس ناقابلِ شکست
جادو کی گرفت سے جُدا نہ کر سکے گا۔ وہ چند لمحوں کے لئے اسی پیچیدہ کشمکش میں مبتلا رہا۔

پھر وہ اُٹھا اور اپنی محبوبہ کی بانسری لی۔ اس نے بڑی ہی دھیمی سروں میں ایک
پرانا گیت "خوں آشام محبوبہ" گایا۔ چند لمحے تو بہتے لگا کہ اس حصّہ میں متروک ہو چکا تھا
نغمے کی حسین اور رحم بھرے دل نے میڈلائن کے کانوں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر کے اُسے
بیدار کر دیا۔ اُس نے ایک ہلکی سی آہ بھری۔ وہ خاموش ہو گیا۔ میڈلائن کا سانس تیزی
سے چلنے لگا۔ اور اس کی سہمی ہوئی آنکھیں کھل کر چمک اٹھیں۔ پرفیرو دوزانو ہو گیا۔
وہ نازک پتھر کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا۔

اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اور پوری طرح بیدار تھی۔ لیکن پھر بھی وہ خواب
دیکھ رہی تھی۔ اس کے حسین و جمیل خواب کی لطف فرمائیوں میں ایک کربناک انقلاب
رونما ہوا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر دیئے اور وہ بے معنی باتیں کہہ کہہ کر آہیں بھرنے
لگی۔ لیکن پھر بھی اس کی آنکھیں پرفیرو کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں جو با ادب اپنی
آنکھوں میں التجائے رحم کی دنیا بسائے جھکا ہوا تھا میڈلائن اتنی خواب آلود معلوم
ہوتی تھی کہ وہ زبان کھولنے یا کسی قسم کی جنبش کرنے سے ڈرتا تھا۔

"پرفیرو!" اس نے کہا۔ "ابھی ابھی تمہاری آواز میری سماعت میں ایک ایسی موسیقی
بن کر سما رہی تھی جس کے ہر زیر و بم میں محبت کے حسین ترین وعدے مچل رہے تھے، اور
یہ غم آفریں آنکھیں ملاءِ اعلیٰ کے نگینے معلوم ہوتی تھیں۔ تم کتنے بدل گئے ہو۔ کتنے پژمردہ،

سرد اور خشک ہو گئے ہو۔ پیارے پرفیرو۔ مجھے پھر وہی آواز سناؤ۔ میں انہی لافانی آنکھوں کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہوں۔ دہی میٹھے شکوے وہی پیاری شکایتیں۔ اتنی غم آلود محبت مجھے پسند نہیں۔ مجھے اس لافانی کرب میں مت چھوڑو۔ اگر تم مر گئے تو دنیا میں میرا ٹھکانہ نہ رہے گا۔

پرفیرو دفعتہ ایک فانی انسان سے ایک ملکوتی ہستی میں بدل گیا۔ اس کا رنگ سرخ ہو گیا اور وہ فضائے بسیط کی نیلگوں پہنائیوں میں چمکنے والے ستارے کی طرح دمک اٹھا۔ جس طرح گلاب کی نزاکت میں بو بس جاتی ہے۔ اسی طرح پرفیرو میڈیلاین کے خوابوں میں تحلیل ہو گیا۔ اس اثنا میں کہر آلود ہوا کھڑکی کے آئینوں کے ساتھ ٹکراتی رہی۔ اور سینٹ اگنیز کے میلے کی رات کو سیلاب نسیم میں بدل دینے والا چاند آہستہ آہستہ غروب ہو گیا۔

"تاریکی چھا گئی ہے۔ اولے سرعت سے گر رہے ہیں۔ یہ خواب نہیں ہے میری محبوبہ! میری میڈلاین۔ اندھیرا چھا گیا ہے۔ برف و باراں کا طوفان ابھی تک گرج رہا ہے۔ یہ خواب نہیں ہے۔ آہ! آہ! یہ میں بدنصیب ہی ہوں۔ پرفیرو مجھے اسی جگہ مرجھا کر مر جانے کے لئے چھوڑ جائے گا۔ ظالم! کسی دغاباز نے تمہیں یہاں تک آنے دیا۔ باوجودیکہ تم ایک فریب خوردہ لڑکی کو ایک بجھے ہوئے پروں والی اور ٹکڑی سے بچھڑی ہوئی کونج کو اس طرح اکیلے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ لیکن میں پھر بھی تمہیں بددعا نہیں دیتی۔ آہ! میرے دل کی ساری دھڑکنیں تمہارے لئے ہی ہیں۔"

"میری میڈیلاین! حسین خواب دیکھنے والی میڈیلاین! حسین دلہن!

کہو کیا میری خوش نصیبی نے تمہیں ہمیشہ کے لئے میری مہربان بنا دیا ہے؟ کیا میرا دل ہمیشہ کے لئے تیرے حُسن کی ڈھال بن سکتا ہے؟ اتنے مصائب جھیلنے اور اس قدر تکالیف برداشت کرنے کے بعد میں اس روپہلی مندر میں آرام کروں گا۔ یہ معجزہ ہوگا۔ میں نے تمہیں پا لیا ہے۔ لیکن پھر بھی میں تمہارا گھونسلا برباد نہیں کرنا چاہتا۔ اگر تم میرا اعتبار کرو۔ تو میری پیاری سینڈریلا پن تم مجھے وحشی بے دین نہیں پاؤگی۔

سنو! یہ طوفان پریوں کی سرزمین سے اٹھا ہے۔ اور گو بظاہر بڑا ہی تباہ کن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں رحمت ہے۔ اُٹھو! اُٹھو! صبح ہوئی چاہتی ہے۔ شراب طرب کے یہ بھولے ہوئے متوالے کبھی بھی کچھ نہ سن سکیں گے۔ اٹھو ہم انتہائی تیزی سے اُڑ چلیں۔ یہاں کوئی کان ایسا نہیں ہے جو کچھ سُن سکے۔ نہ ہی کوئی آنکھ ایسی ہے جو ہمیں دیکھ سکے۔ یہ سب شراب اور نیند کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہیں۔ جاگو! اٹھو! میری محبت کے منتہی اور بے خوف و خطر ہو جاؤ۔ جنگلوں کے اُس پار تمہارے لئے ایک مکان تیار ہے۔

یہ الفاظ سُن کر وہ جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی لیکن خوف اب بھی اُس کی رگوں میں کانپ رہا تھا۔ کیونکہ چاروں طرف تیز آنکھوں والے خوفناک اژدہے بھالے لئے سو رہے تھے۔ وہ فراخ سیڑھیوں پر سے اتر کر ایک تاریک راستے پر چل دیئے۔ تمام گھر میں کوئی انسانی آواز سنائی نہ دیتی



عبدالرحیم شبلی بی کام

یہ نظم بلحاظ شاعری تسلسل اور قوّتِ بیان کیٹس کی دوسری نظموں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر جان کیٹس اپنی ساری زندگی میں اس نظم کے سوا اور کچھ نہ لکھتا۔ تب بھی وہ انگلستان کے بہترین شاعروں میں سے ہوتا۔ اس نظم کا اصل ماخذ ڈرائیڈن کی ایک کہانی ہے۔ کیٹس نے اس کہانی میں کچھ تغیرات کئے ہیں۔ اس نے لیمیہ کو ایک قابلِ نفرت بدقماش جادوگرنی کی جگہ آسمانی حور کی صورت میں پیش کیا ہے جس نے ارضی محبّت کا لطف اٹھانے کے لئے انسان کا دھارن لیا۔ فلسفہ کی کہربائی طاقت کے سامنے لیمیہ کا دھواں بن کر رہ جانا پڑھنے والے کو اس بدنصیب ہستی کا ہمدرد بنا دیتا ہے۔ جان کیٹس نے ڈرائڈن پر حقیقتاً ایک زبردست احسان کیا ہے کہ اُس کے اِس غیر دلچسپ کردار میں محبّت اور ہمدردی کی رُوح پھُونک کر اُسے زندہ جاوید کر دیا ہے جیسا کہ پچھلے اوراق میں عرض کیا گیا۔ جان کیٹس ایک مصوّر شاعر ہے۔ لیمیہ میں اُس کی یہ خصوصیّت بڑی نمایاں نظر آتی ہے۔ جس خوبصورتی اور فنّی کمال سے کیٹس نے مختلف مناظر قلمبند کئے ہیں وہ یقیناً قابلِ مطالعہ ہیں۔

حصّہ اوّل

اگلی پریوں نے جنگل کے دیوی دیوتاؤں کو سرسبز و شاداب جنگلوں سے باہر نہیں نکالا تھا۔ اور نہ ہی اوبرآن دیوتا جس کے خوف سے ڈریاد اور فانس رنگین پھلواڑیوں اور سرسبز جھاڑیوں کو خیرباد کہہ کر چھپے گئے تھے۔ اپنے مطلا و مکلل تاج و عصا اور اپنی مرصع و مسجع قبا کے ساتھ سربرآرائے سلطنت ہوا تھا ——

اُن ایام کا ذکر ہے کہ عشق زدہ ہرمیز اپنے طلائی تخت سے اُترا اور آنکھ بچا کر باہر نکل جانے کی ٹھان لی —— وہ آہستہ آہستہ دیوتاؤں کے بلند و بالا اولمپس سے بچ کر نکلا —— دیوتائے اعظم کے بادلوں کی اُس طرف —— تاکہ دیوتا کے قاصد کی عقابی نظروں سے اوجھل رہے —— اور جزیرۂ قبرص کے ساحل پر ایک ہرے بھرے جنگل میں جا اُترا ——!

اُس مقدس جزیرے میں ایک دوشیزہ جل پری کا مسکن تھا جس کے سامنے تمام کھروں والے ساتر دو زانو ہوتے تھے اور جس کے سیمیں قدموں پر بحری دیوتا ٹرائی ٹن لعل و جواہر نچھاور کرتے۔ اور زمین پر اس کی یاد میں مضطرب و بدحال رہتے اور اسی کے تصور میں آٹھوں پہر سرنگوں ہوئے جاتے تھے!

جزیرے میں چشمے کے قریب ہی جہاں یہ دوشیزہ پری غسل کرتی اور جس سبزہ زار میں وہ گلگشت کے لئے جایا کرتی۔ میں اکثر قیمتی تحائف سے لادا ار رہتی تھی —— وہ اپنے گوہر بے بہا تحائف۔۔۔ [illegible] کی نظر سے بالا اور رعونت

ادراک کی حد سے یقیناً ماورٰی تھے ——— آہ محبّت کے کتنے بے پایاں سمندر اس کے قدموں میں موجزن تھے ——— !!

یہ خیال ہرمز کے دل میں آیا۔ اور اس پر ایک روحانی کیف چھا گیا۔ آتشِ عشق اس کے جسم میں سرتاپا سرایت کر گئی۔ اور اس کی سنہری زلفوں کے درمیان ——— جو رقیبانہ انداز سے اس کے عُریاں شانوں پر بکھری رہتیں ——— اس کے گلابی رُخسار گُلِ لالہ کی طرح سُرخ ہو گئے ——!

ہر چیز پر پھیلائے جنگلوں اور وادیوں پر محوِ پرواز تھا۔ اور پھولوں پر اپنی نئی محبّت کا اثر ڈالتا جاتا تھا۔ وہ بہت سے دریاؤں پر سے گذرتا ہوا ان کے منبع تک جا پہنچا ——— اسی تلاش میں کہ شاید وہ دوشیزہ جل پری کہیں اُس کی نظر پڑ جائے لیکن یہ سب کچھ بے سُود تھا۔ اس کی پیاسی نظریں تشنہ کام ہی رہیں۔ اور وہ اُس کا دیدار نہ کر سکا۔

آخر وہ ایک سنسان جگہ پر آ کر ٹھہر گیا ——— متفکر اور دیوتاؤں کے تکلیف دہ رشک سے مملو وہ وہاں کھڑا تھا کہ اسے ایک دلخراش اور درد انگیز آواز آئی ——— ایسی دلخراش آواز کہ ایک شقی القلب کا جگر بھی اُسے سُن کر پاش پاش ہو جاتا۔ اور اس کے دل میں محبّت اور شفقت کی ایک مقدّس لہر دوڑ جاتی ——— وہ دردبھری آواز یہ کہہ رہی تھی۔

"آہ، مجھے اس بدتر رقیب سے کب نجات حاصل ہو گی؟ اور کب میں ایک زندگی سے دھڑکتا ہوا جسم ہو کر زمین پر بسر کر رہی ہوں گی؟ اور کب میں محبّت کے ساتھ دنوں اور راتوں کا خوش گوں کھیل شروع [illegible] ... ... ——— !" آواز گونج

کر رہ گئی۔

اس اثناء میں دیوتا ہر سبز کبک خرامی سے آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اور اپنے مخملیں قدموں سے جھاڑیوں اور درختوں کو چھو کر ادھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر ایک حرکت کرتے ہوئے ناگ پر پڑی جو چمکتا دمکتا رات کی سیاہی میں کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔

وہ ناگ ایک پیچ دار حلقہ بنائے خیرہ کن رنگوں سے چمک رہا تھا۔ اس کے شنگرفی، سنہری، سبز اور نیلے رنگ عجب بہار دکھا رہے تھے۔ گورتر کی طرح اس پر دھاریاں تھیں۔ چیتے کی طرح اس کا داغدار جسم تھا۔ طاؤس کی طرح آنکھیں تھیں۔ اس کے شفاف جسم پر سیمیں چندرما اس کے سانس کے ساتھ ساتھ ظاہر اور پنہاں ہوتے تھے۔ وہ سب رنگ مل کر ایسی بہار دیتے تھے جیسے افق پر قوس قزح لیکن ان رنگوں میں ایک غم کی یاد دیتی تھی۔ سانپ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا ایک غمگین صورت پری یا کوئی عفریت کی مادہ یا خود عفریت ہی ہے۔

اس کی کلغی قیس ابیض سے گندھی ہوئی تھی جس پر تارے ٹکے تھے۔ اندر وہ اردیانی کے ٹکٹ کی طرح خوش نما تھی اس کا سر سانپ کا سا تھا۔ لیکن آہ اس کا چہرہ عورت ایسا تھا۔ اور اس کا منہ موتیوں ایسے سفید دانتوں سے چمک رہا تھا اور اس کی آنکھیں ——— آہ، وہ حسین آنکھیں کس لئے بنی تھیں؟ محض اپنے حسن پر آنسو بہانے کے لئے ——— ان آنکھوں سے اشکوں کا ایک سیلاب جاری تھا۔ جس طرح پروزرپائن ملک سسلی کی یاد میں تڑپ رہی ہو۔ اس کی گردن سانپ کی سی تھی لیکن وہ شیریں نغمہ جو اس کے اندر سے اٹھ رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا۔

کہ کسی آبشار تسلسل سے پیدا ہو رہا ہے!

دیوتا ہر مبز اپنے پنجوں پر ایک شاہین کی طرح جو کسی ——— شکار پر جھپٹ رہا ہو۔ کھڑا تھا۔

اتنے میں سانپ نے حرکت کی اور کہا:۔

"خوبصورت دیوتا ہرمبز! کلغی والے اور سرسراتے ہوئے پروں والے دیوتا!!!
میں نے کل رات تیرے متعلق ایک عظیم الشان خواب دیکھا تھا۔ میں نے تجھے ایک سنہری تخت پر بیٹھے ہوئے پایا۔ دیوتاؤں کے درمیان ——— پرانے اولمپس کی چوٹیوں پر ——— تجھے اُداس دیکھا۔ وہاں اکیلا تو ہی اُداس بیٹھا تھا۔ بلندیوں پر میوزز کی شہنائیوں سے ایک شیریں گونج پیدا ہو رہی تھی۔ اور اپالو کا مدہوش کن نغمہ ——— آہ وہ طویل طویل غم انگیز نغمہ ——— سنائی دے رہا تھا۔ مگر تو غم کے سمندر ہی میں مستغرق رہا۔ پھر میں نے تجھے قرمزی لباس فاخرہ زیب تن کئے ہوئے دیکھا۔ تو بادلوں میں چھپتا۔ اور ظاہر ہوتا۔ سنہری پروں کے ساتھ محو پرواز تھا۔ بادلوں سے تو ایسے ظاہر ہوتا تھا جیسے اُفق سے صبح نمودار ہوتی ہے تو اپنے بازو پھیلائے فضا میں سورج کی کرن کی طرح تیزی سے سفر کر رہا تھا ——— تو پوری تندہی سے کریتی کی طرف آ رہا تھا ——— اور اب تو میرے سامنے موجود ہے۔ اے شریف دیوتا کیا تو نے اپنی محبوبہ پالی؟

اس بات کو سنتے ہی بحر فراموشی کے موتی ہرمبز نے ذرا توقف نہ کیا۔ اور یوں زمزمہ پرواز ہوا:۔

"اے نرم ہونٹوں والے موسیقی نواز افعی! تیرا خوبصورت کنڈل اور غم آلود

نگاہیں ایک آسمانی برکت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ مانگ جو مجھ سے مانگتا ہے۔ لیکن اس کے بدلے مجھے صرف اتنا بتا دے کہ میری دوشیزہ، جل پری کہاں ہے! اور وہ کس جگہ اپنی نکہت پرور سانس سے فضا کو معطّر کر رہی ہے؟"

افتی کے چہرے پر ایک سُرخی کی لہر دوڑ گئی اور بولا:۔

"اے چمکدار ستارے! تو نے کہہ تو دیا ہے۔ لیکن اے حسین دیوتا! اس وعدہ کو اپنی قسم سے پختہ کر۔"

ہرمیز نے کہا:۔

"اچھا میں اپنے جادو کے عصا کی قسم کھاتا ہوں اور تیری شعلہ زن آنکھوں کی، اور تیرے منقش تاج کی ـــــ اور اس کے پرجوش الفاظ پھولوں کی لطیف خوشبو کے دوش پر خاموشی کے ساتھ پرواز کر گئے۔

پھر سانپ نے حرکت کی۔ اور کہا:۔

"اے خواہشوں سے پُر دیوتا! تیری گم شدہ دوشیزہ باوجود غائب ہونے کے ہوا کی طرح آزاد ہے۔ اور آنکھوں سے اوجھل ان بے خار جنگلوں میں گھومتی پھرتی ہے۔ وہ بغیر جلوہ ریزی کے اپنے خوشگوار ایام گذار رہی ہے۔ شبریں پھولوں اور خوشنما پتوں پر اس کے ننھے ننھے پاؤں کے نشان دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ درختوں پر منڈھی ہوئی لمبی بیلوں اور ثمردار جھکے ہوئے درختوں سے وہ غیر مرئی طور پر پھل توڑتی ہے۔ وہ چشموں پر اپنی زلفیں شانوں پر بکھیرے نہاتی ہے مگر اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ اور یہ میرا ہی جادو ہے کہ میں نے اس کے حُسن کو مستور کر رکھا ہے: تاکہ وہ ساتر اور رفانس کی نگاہوں سے جو حقیقی جذبہ سے تہی دامن ہیں محفوظ رہے۔ یسائی نس کی آہوں سے جن کے اندر حقیقی سوز و گداز کا نام نہیں وہ بچی رہے۔ اور تمام

دیوتاؤں کی ہوسناکی دیکھ کر اُس کی صورت پژمردہ ہو گئی تھی۔ میں نے اس پر رحم کھایا
اور اُسے کہا کہ وہ اپنے بالوں کو جادو کے پانی میں بھگو لے تاکہ اس کی خوبصورتی بدنظری
سے اوجھل رہے۔ تاہم وہ آزاد ہے۔ اور جہاں چاہے پھر سکتی ہے۔ سارے دیوتا تو
اُسے دیکھیں گے۔ اور صرف اکیلا تو ہی اُس کے جلووں سے متمتع ہو سکے گا۔ بشرطیکہ
تو اپنی قسم کے مطابق میری خواہش پوری کر دے۔"

ایک دفعہ پھر بیون دیوتا نے قسم کھائی جو حقیقت اور صداقت سے لبریز
تھی۔ اور جس میں ایک سوز جھلک رہا تھا۔

اس سچی سوگند سے متاثر ہو کر اُفسی نے اپنا چمکدار چہرہ اُٹھایا۔ اور ایک
عجیب مسکراہٹ اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ لڑکھڑاتے ہوئے اُس نے
کہا:۔

"میں ایک حسین ماہ وش عورت تھی۔ ایک دفعہ پھر مجھے عورت بنا دے ——
ہاں ایک پری پیکر خوبصورت عورت —— اور مجھے قریش کے ایک نوجوان سے
محبت ہے۔ مجھے اس کے قریب پہنچا دے —— دیوتا ہرمیز اب نیچے جھک جا
تاکہ میں تیری مژگاں پہ پھونکوں۔ اُس کی برکت سے تو بھی اپنی دوشیزہ پری کو
دیکھ لے گا ——!"

دیوتا اُسی وقت اپنے پہیٹ کے نیچے جھکا۔ سانپ نے اُس کی آنکھوں پہ پھونکا
پھونکا اور حیرت الیقین میں ایک دوشیزہ جل پری اُس کے پاس ہی سبزے پر کھڑی
[illegible] تھی ——!

یہ تو تھا خواب۔ خدایا شاید خواب ہی ہو —— کیونکہ دیوتاؤں کے خواب بھی

واقعیت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی غیر فانی خوابوں کی دنیا میں مسرور رہتے ہیں ——— !

حدّتِ عشق سے بے قرار اور آتشِ محبت سے سوختہ وہ پہلے تو ایک لمحہ کے لئے اس جنگلی پری کے ارد گرد منڈلایا ——— اس کا سارا جسم دہک رہا تھا پھر وہ ہرے بھرے گھاس پر جس کو تا حال پابوسی کا شرف حاصل نہ ہوا تھا۔ آہستگی سے اُترا اور نیم خفتہ سانپ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے پہلی مرتبہ اپنے قدلبیہ کے طلسماتی عصائی آزمائش کے لئے اپنا نرم و نازک ہاتھ بڑھایا۔

بعد ازیں اس نے دزدیدہ نگاہوں سے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے پیہم ایسے اشک رواں تھے۔ جو دیوتا کی پرستش کے وقت عجز و گریہ کے سبب بے اختیار نکل آیا کرتے ہیں۔

وہ اُس کی طرف بڑھا۔ لیکن وہ خزاں کے زرد پیلے چاند کی طرح جب وہ ندریجاً گھٹ رہا ہو۔ ماند پڑ گئی۔ خوفزدہ ہو کر اس نے اپنی سسکیوں کو روکنے کی ناکام کوشش کی۔ اور وہ اس پھول کی مانند کملا کر رہ گئی۔ جو سرِ شام ہی مرجھا جاتا ہے۔

جب دیوتا نے پری کے ٹھنڈے ہاتھوں کو گرمایا تو اُس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں جس طرح صبح صبح شہد کی مکھیوں کے والہانہ گیتوں کے اثر سے غنچے پھول بن جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ حُور صفت اور ماہ وش پری بھی اپنی پوری رعنائی اور خوبصورتی کے ساتھ دیکھنے والوں کی شبستانِ کائنات کے لئے ماہِ تاباں بن گئی۔

پھر وہ سبزہ زار جنگلوں کی عزلت گاہوں میں پرواز کر گئے۔ جہاں وہ انسانی مخلوق کی طرح کبھی زرد نہ پڑے۔ بلکہ ان کے چہرے ہمیشہ خوشی اور مسرت کی وجہ سے دمکتے رہے ——!

جب ناگ اکیلا رہ گیا۔ تو اس پر فوری تغیرات ہونے لگے۔ اس کے خُوری خون میں جوش پیدا ہو گیا۔ اس کے مُنہ میں جھاگ آنے لگی۔ اور جب یہ زہریلی شبنم گھاس پر گرتی تو وہ بھی کُملا جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں تکلیف کی وجہ سے پتھرا کر رہ گئیں اور ان سے فاسفورس کی مانند شعلے بھڑک اُٹھے۔ کسی آنسو نے انہیں ٹھنڈا نہ کیا۔

اس کے جسم کے سارے رنگ شعلہ زن ہو گئے۔ شدتِ کرب کی وجہ سے وہ تڑپنے اور پھڑکنے لگی۔ ایک گندھکی رنگ کے آتش گیر مادہ نے اس کے جسم پر بنے ہوئے چندرما کی جگہ لے لی۔ اور جس طرح ایک آتش فشاں پہاڑ سبزہ زار کو تباہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح اُس آتشگیر مادے نے اس کے سنہری کمربند اور مرمریں جلد کو پھونک کر رکھ دیا۔ اور اس کی دھاریوں، لکیروں اور داغوں کو خاکستر کر دیا۔ اس کے جسم پر جو ہلال بنے ہوئے تھے۔ ان میں گرہن لگا دیا۔ اور ستاروں کو بالکل فنا کر دیا۔

الغرض چند ہی لمحات میں وہ تمام لعل و یاقوت اور زمردوں سے محروم ہو گئی۔ اور اس کے جسم پر سوائے دُکھ اور تکلیف یا بدصورتی کے کچھ نہ رہا۔ اس کے سر پر ایک تاج چمک رہا تھا۔ لیکن وہ بھی غائب ہو گیا۔ اور وہ خود بھی اسی سرعت کے ساتھ ناپید ہو گئی۔ اور اس کی آواز —— بانسری کی طرح سریلی —— "لائی شمس، پیارے لائی شمس" —— مصفا کبر کے دوش پر اڑی۔ اور پہاڑیوں کے شور و غوغا میں جا کر گم ہو گئی۔ پھر فبرص کے جنگلوں نے اس کی آواز کو دوبارہ نہ سُنا۔

"لیمیتہ کہاں گئی؟ وہ جواب ایک خوبصورت دیوی تھی ـــــ مکمل حسینہ، نئی نویلی، بے مثال ـــــ؟

وہ اس وادی میں اُڑ کر چلی آئی تھی۔ جو قرنطبہ اور ساحل سنشری کے درمیان مسافروں کو نظر آتی ہے۔ اور اُن جنگلی پہاڑوں کے دامن میں کھڑی تھی۔ جہاں سے پیرین کی ندیاں نکل کر بہتی ہیں۔ اور جن کی پُشت کی بنجر گھاٹیاں کلیون کے جنوب مغرب کی طرف جا نکلتی ہیں۔

وہ وہاں کھڑی تھی ـــــ جنگل سے قریب ہی ـــــ ایک سبزہ زار ڈھلوانی راستے پر، ایک شفاف تالاب کے کنارے اور اپنے آپ کو مصائب کے جنگل سے آزاد دیکھ کر نہایت مسرور تھی ـــــ اس کی ساری بادِ نسیم کے خوشگوار جھونکوں سے نیلوفر کے نازک پھولوں کی طرح لہلہا رہی تھی ـــــ!

کتنا خوش نصیب تھا ئی لائیمس!! کیوں کہ وہ سب حسینوں میں سے زیادہ حسین تھی کسی دوشیزہ کی اُس ایسی زلفیں نہ تھیں۔ اور نہ کسی ماہ وش نے اس کی ایسی آہوں سے فضا کو گرمایا تھا۔ نہ کسی کا چہرہ اس کے چہرے کی طرح عمیق حسیات سے ضوفگن ہوا تھا۔ اور نہ ہی کسی مہ جبیں نے اُس کی مانند اپنے رقص و سرود سے کسی کو مسحور کیا تھا ـــــ وہ ایک دوشیزہ تھی، معصوم لبوں والی۔ تاہم دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے عشق کے جذبات میں ماہر تام اگرچہ اُس کی عمر طبعی تاحال ایک ساعت ہوئی تھی۔ لیکن اس کا دماغ حکیمانہ تھا۔ وہ خوشی کو غم سے الگ کر کے ان کی باقاعدہ حدود مقرر کر سکتی تھی۔ اور ان کے ملے ہوئے اجزا کو جدا کر کے انہیں بسُرعتِ کمال ایک دوسرے میں جذب ہو جانے سے بچا سکتی تھی۔ اور وہ اُن کے بظاہر دلفریب اوغام کو

کمال چابکدستی سے علیحدہ علیحدہ کر کے ان کے پریشان ذرات کو مناسب طور پر ترکیب دے سکتی تھی ـــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے عشق کے دیوتا کی درسگاہ میں رہ کر ایک ہونہار تلمیذ کی طرح خوشگوار ایام گذارے ہیں۔ اور وہاں سے اس نے مکمل تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے باوجود وہ باعصمت تھی۔ اور اپنی "ارغوانی اصطلاحیں" اس نے کسی اور وقت کے لئے محفوظ رکھی ہوئی تھیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اُس ماہپارے نے خاص طور پر یہ راستہ اپنے لئے کیوں منتخب کیا؟

ہم اس سوال کے جواب کی ابھی تلاش کریں گے لیکن پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ جب وہ افعی کے روپ میں تھی تو وہ کس طرح اپنے جادو کے زور سے خیال آفرینیاں کرتی اور کس طرح وہ اپنی جگہ پر بیٹھی عالیشان، حیرت افزا اور عجیب و غریب ایشیا کے متعلق ذہن میں تصور باندھا کرتی تھی۔ اور جب وہ چاہتی اس کی روح اُس کے تصورات کے ہمراہ چلی جاتی تھی۔!

روح آباد کی دھندلی دنیا میں یا ان دلفریب لہروں کو پلٹ کر جن کے دوش پر جزیرہ کی سنبلیں زلفیں پریشان ہوتی تھیں۔ وہ موتیوں کی سیڑھی سے اُتر کر خشیٹے کی کٹیا میں دبے پاؤں چلی جایا کرتی یا اس بدمست دیودار کے نیچے جہاں نفوس دیوتا جوش فرح سے اپنی بزم برپا کیا کرتا تھا۔ یا بیلا تدیس کے ان باغات میں جہاں ملکی ہر کے قریب مرد مخملات اپنے متوازی ستونوں کے ساتھ جگ مگ جگ مگ کر رہے ہوتے تھے یعنی ان انسانوں کے شہروں میں وہ اپنی خوابیں بھیج دیا کرتی تھی۔ جہاں وہ ہمیشہ مسرت کے شور و غل کے ساتھ ختم ہو کر رہ جاتیں۔

[illegible]

[illegible]

گھوڑ دوڑ میں اپنی رتھ کو سب سے آگے اڑائے لئے جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ دیوتائے اعظم کے چہرے کی طرح پُر سکون اور متین تھا ـــــ!

اب اُس شام پروانوں کے وقت لائی تھس نے اس راہ سے گذرنا تھا۔ اور وہ خوب جانتی تھی کہ وہ ساحل سے ہو کر قرنطیہ کی طرف جائے گا۔

مشرق کی طرف سے نسیمِ بحری چل رہی تھی۔ اور اس کی کشتی کا کانسی سے منڈھا ہوا اگلا حصہ مشتری کی بندرگاہ میں ریتیلے ساحل سے ٹکرایا۔ وہ ایجینا کے جزیرے سے آ رہا تھا۔ جہاں وہ خدائے اعظم مشتری کے آگے جس کا مندر اُس جزیرے میں اپنے مرمریں دروازوں کے ساتھ خون اور عنبریں خوشبوؤں کا منظر ہے قربانی دینے گیا ہوا تھا۔

دیوتا نے اس کی آہ و زاری سُنی۔ اور اس کی دعا قبول کی۔ اب وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ چکا تھا۔ اور شاید ان کی قرنطیہ کے متعلق غیر دلچسپ باتوں سے تنگ آ کر وہ تن تنہا محوِ خرام تھا ـــــ!

سنسان پہاڑیوں پر وہ جا رہا تھا ـــــ تہی دماغ ـــــ لیکن نجمِ شب کے طلوع سے قبل وہ افلاطون کے اس پیچیدہ اوراق فلسفہ کے سکون افزا شفق کے تصور میں مستغرق ہو گیا۔ جہاں عقل و خرد ناکارہ ہو جاتی ہے ـــــ!

لیمیہ نے اُسے آتے دیکھا ـــــ قریب اور لحظہ بہ لحظہ زیادہ قریب ـــــ وہ آ رہا تھا لیکن بالکل لاپرواہانہ اس کی بے آواز چپلیاں سرسبز گھاس پر پھسل رہی تھیں وہ قریب ہی کھڑی تھی ـــــ لیکن نظروں سے اوجھل ـــــ وہ گزر گیا ـــــ اسرار میں بند ـــــ اس کے خیالات فلسفہ کے لبادہ میں لپٹے ہوئے ـــــ!

مگر اُس زہرہ جبیں کی آنکھوں نے اس کا تعاقب کیا ـــــ اُس نے اپنی ملکوتی

گردن خم کی اور یوں ترنم ریز ہوئی ـــــ

"خوبصورت لائی شمس! اور کیا تم مجھے پیاسا ہی چھوڑ جاؤ گے! لائی شمس پیارے!
مڑ کر تو دیکھو!! اور خدا کے لئے کچھ رحم کرو!!!

اس نے ایسا ہی کیا لیکن حیرت خیز سرو آنکھوں سے نہیں بلکہ آرفیس کی طرح جب
اس نے پوری طرح اُس کی طرف دیکھا تھا کیونکہ اب بیٹھے تھے وہ نغمے جو اُس نے الفاظ کی
صورت گائے۔ کہ اُسے محسوس ہوا کہ وہ اُس آواز کو مدت دراز سے پہچانتا ہے

جب لائی شمس نے اُس کی خوبصورتی اور رعنائی کا سیر ہو کر نظارہ کر لیا حتیٰ کہ سُکر
انگیز جام میں ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا ـــــ اگرچہ پیالہ پھر بھی لبریز تھا ـــــ تو اُس نے اِس
خوف سے کہ وہ اُس کے خراج تحسین ادا کرنے سے پہلے ہی پرواز نہ کر جائے۔ یوں داد تحسین
دینے کی کوشش کی ـــــ

"میں تجھے اکیلا چھوڑ جاؤں؟ ـــــ آہ دیوی ادھر تو دیکھ! دیکھ کہ میری آنکھیں تو تیرے
معبد سے ہٹتی ہی نہیں۔ خدا کے لئے میرے دل کو مایوس نہ کر۔ اگر تو نظروں سے غائب ہو گئی
تو میں یقیناً مر جاؤں گا ـــــ ٹھہر جا۔ خواہ تو دریاؤں کی دیوی ہے ـــــ ٹھہر جا۔ کوئی
مضائقہ نہیں۔ تیری ندیاں یہیں سے تیرے حکم کی تعمیل کریں گی ـــــ ٹھہر جا۔ خواہ تو جنگلوں
کی ملکہ ہے ـــــ کوئی حرج نہیں۔ ٹھہر جا ـــــ تیرے درخت تیرے بغیر ہی شبنم
کا پانی پی لیں گے۔ اگر تو پلیاد کی نسل سے ہے تو بھی چنداں نقصان نہ ہوگا۔ تیری بہنیں تیرے
کرۂ ارضی کو اپنی ہم آہنگی سے برقرار رکھیں گی۔ اور تیری جگہ اُن میں سے کوئی ضو فشاں ہو جائے
گی ـــــ آہ کس قدر شیریں نغموں میں تیرا اسلام مجھے پہنچا۔ اگر تو غائب ہو گئی تو میں صرف
ایک سایہ بن کر ڈھل جاؤں گا ـــــ! خدا کے لئے میری نظروں سے غائب مت ہونا!

"اگر میں یہاں ٹھہروں ——" وہ ماہ پیکر بولی —— "اس مٹی کے بنے ہوئے فرش پر اور اپنے قدموں کو تکلیف پہنچاؤں۔ اِن پھولوں سے جو میرے لئے کہیں زیادہ نا ملائم اور کھُردرے ہیں تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم میرے دل سے میرے وطن کی خوشگوار یاد محو کرنے کے لئے کیا کرو گے؟

تم مجھے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ میں تمہارے ساتھ ان وادیوں اور اِن پہاڑیوں پر گامزن رہوں۔ جہاں کوئی مسرت اور کوئی خوشی نہیں ہے —— ہاں جہاں بقا محض ایک خواب ہے۔ اور خوشی عنقا ——

لائی شس! تم عقلمند آدمی ہو تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔ کہ غیر مرئی روحیں انسانی فضا میں سانس نہیں لے سکتیں۔ نا سمجھ انسان! مجھے بتاؤ کہ تیرے پاس میری رُوح کے مناسب حال کونسی فضا ہے جس میں تو مجھے رکھنا چاہتا ہے۔ وہ کونسے محلات ہیں جو تو مجھے دے گا! تاکہ میں وہاں اپنی ساری آرزوؤں کو پورا کرسکوں۔ اور اسرار سربستہ کے ذریعہ سے اپنی ہزاروں خواہشوں کو تکمیل کی سیڑھی پر پہنچا سکوں —— نہیں یہ ہرگز نہیں ہوسکتا اچھا خدا حافظ!!"

یہ کہہ کر وہ ایڑیوں کے بل اُٹھی۔ اور اپنے سفید براق بازو پھیلا دیئے۔

لائی شس اس غم سے کہ اُس کا حسین وعدہ اُس سے چھین لیا گیا ہے نیم بیہوش ہوکر گر پڑا —— اور محبت کے متعلق گنگناتا ہوا وہ بے ہوش ہوگیا اور تکلیف سے زرد یا۔ اپنے نازک عاشق کی اس تکلیف پر اُس سنگدل ظالم عورت کو ذرا بھی رحم نہ آیا۔ اس کے برخلاف اگر اس کی آنکھیں زیادہ روشن ہوسکتی تھیں تو وہ ہوگئیں۔ اور اِن چشم روشن اور دل شاد کے ساتھ اُس نے اپنے نئے نویلے کنوارے ہونٹ اس کے لبوں پر رکھ دیئے

اور اپنے پھندے میں پھنسی ہوئی "روح" کو ایک نئی زندگی عطا کر دی ــــ

اور جب وہ ایک بے ہوشی سے دوسری بے ہوشی میں منتقل ہو رہا تھا، تو اس نے زندگی، محبت اور حسن سے متاثر ہو کر ایک طرب انگیز ساز چھیڑا۔ ایسا ساز جو ارضی مغنیوں کے گانوں سے بھی کہیں زیادہ شیریں تھا ــــ اور جسے سننے کے لئے ستاروں نے بھی اپنی بھولی ہوئی سانس کی آگ کو ایک لمحے کے لئے تھام لیا ــــ

پھر وہ ایک تھرتھراتی ہوئی نرم آواز میں اس سے گویا ہوئی جس طرح بچھڑے ہوئے دوست فراق کے تکالیف دہ ایام گذارنے کے بعد آپس میں ملتے ہیں۔ اور وہ کنج تنہائی میں بیٹھ کر نگاہوں کی بجائے سرگوشیوں سے عرض حال کیا کرتے ہیں۔ اس نے لائی شمس کو اپنا سر اٹھانے کے لئے کہا۔ اور اس کی روح کو شک و شبہ کی ملونی سے یہ کہہ کر منزہ کیا کہ وہ درحقیقت ایک عورت ہے جس کی شریانوں میں لطیف خون کی بجائے دھڑکتا ہوا خون بہہ رہا ہے۔ ــــ اور یہ کہ اس کے ستم رسیدہ دل کو بھی اُسی کی طرح چرکے لگ چکے ہیں۔ پھر اُس نے اس بات پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا کہ اب تک اس کی آنکھیں قرنطینہ میں اس کا دیدار کیوں نہ کر سکیں۔ اس نے بتایا کہ وہ اس جگہ سے کنارے کش رہتی تھی۔ اور اس نے وہاں کئی خوشگوار ایام بسر کئے تھے لیکن اُس کی خوشی ویسی ہی جیسی سونے کی مہروں سے حاصل کی جا سکتی ہے، اور جس میں عشق و محبت کی چاشنی مفقود ہوتی ہے۔ تاہم وینس کے مندر میں جب وہ اس کے قریب سے گذری تھی، ایک خوبصورت ستون کے ساتھ سہارا لئے اور خیالات میں مگن اس نے ایک دفعہ اسے دیکھا۔ پھولوں اور پتیوں کی خوشنما بیلوں کے درمیان جن کو اسی رات نیا نیا کاٹا گیا تھا۔ کیونکہ وہ عدونیہ کی دعوت کی رات تھی۔ وہ کھڑا تھا۔ اس کے بعد وہ اُسے کبھی نہ دیکھ سکی اور ہجر کے صدمے سہتی ہوئی وہ ان ایام

میں رو رہی تھی۔

لائی شمس اپنی "موت" سے بیدار ہوا۔ اور اُسے تا حال وہیں ایک دلفریب نغمہ گاتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر وہ حیرت و استعجاب کی حالت سے خوشی اور مسرت کی حالت میں چلا گیا۔ کیونکہ وہ ایک عورت کی طرح بول رہی تھی اور ہر ہر لفظ جو اُس نے مُنہ سے نکالا۔ اس پر ایک جادو کا اثر کر گیا۔ اور اُسے مسرتِ جاوداں کی دُنیا میں لے گیا۔

جنوبی شاعروں کو پریوں، حوروں اور دیویوں کی مدح سرائی کرنے دو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان آبشاروں، جھیلوں اور غاروں کی رہنے والیوں میں اتنا لطف ہرگز نہیں جتنا ایک اصلی عورت میں۔ جو پرّا کے کنکروں سے پیدا ہوئی ہو۔ یا جس کی ابتدا تخمِ آدم سے ہوئی ہو۔

چنانچہ لیبیہ نے اندازہ کیا۔ اور بالکل صحیح کیا کہ لائی شمس اُسے نر دل سے محبت نہیں کر سکے گا پس اُس نے دیویوں والے رتھہائے پُرالوان کو علیحدہ کر کے ایک عورت کا رُوپ بھر لیا۔ اور اس طرح اس کا دل زیادہ احسن طریق سے موہ لیا۔ اب اُس کی شکل میں کوئی رعب نہ تھا۔ سوا اُس رعب کے جو خوبصورتی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اب اس نے ناوکِ افگنی تو اسی طرح کی لیکن ساتھ ہی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا۔

ان سب باتوں کا جواب لائی شمس نے فصاحت و بلاغت کے ساتھ دیا۔ اور ہر لفظ جو اس نے مُنہ سے نکالا۔ ایک آہ کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔

آخر کار اس نے قرنطیہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور اپنی محبوبہ سے پوچھا کہ اگر اُس کے پاؤں اُس جگہ کے لئے زیادہ نازک نہ ہوں تو کیا وہ اس کے ہمراہ چل سکتی ہے؟

لیمبیہ کے جادو کے زور سے، وہ راستہ بالکل چھوٹا رہ گیا حتیٰ کہ تین میل کا فاصلہ صرف چند قدم بن گیا لیکن محبّت کے اندھے لائی شس کو یہ بات قطعاً محسوس نہ ہوئی وہ سرتاپا محو تھا۔ شہر کے دروازے بھی گذر گئے لیکن اُسے خبر نہ ہوئی۔ اور نہ ہی اُسے جاننے کا خیال آیا۔

جس طرح خوابوں میں انسان باتیں کرتے ہیں۔ قرنطبہ کا شہر اپنے شاہی محلّات، پُر رونق بازاروں اور عیش و عشرت سے مدہوش مندروں کی موجودگی میں ایک دُور گڑگڑاتے ہوئے طوفان کی طرح شام کی سیاہی کے پردے میں گنگنا رہا تھا۔

عورتیں، مرد، امیر، غریب اس سہانے سماں میں چپلیاں پہنے سفید مرمریں فرش پر اکیلے یا کسی کے ہمراہ چہل قدمی کر رہے تھے ــــــ اور اِدھر اُدھر کئی روشنیاں وغیرہ کی وجہ سے جگمگا رہی تھیں جن کی ضیا میں چلتے پھرتے یا کسی مکان کے سایہ میں یا کسی مندر کے دروازے پر یا کسی ستون کے نیچے انسان نظر آ رہے تھے ــــ!

دوستوں کے سلام کے ڈر سے اُس نے اپنا مُنہ لپیٹا ہوا تھا۔ اور جب ایک شخص سفید لمبی داڑھی والا اور تیز و تند آنکھوں اور تیھریلی چھاتی کی طرح سفید "چاند" والا اس کے قریب سے گذرا تو اُس نے اپنی محبوبہ کا ہاتھ زور سے دبایا اور جب وہ آہستہ آہستہ چلنے والا افلاسفروں کی قبا پہنے اس کے نزدیک آیا تو وہ اور زیادہ اپنے لبادے میں سکڑ گیا۔ اور اپنے چلنے کی رفتار دُگنی کر دی۔

جب لیمبیہ کو بھی اُس کے ساتھ تیز رفتار ہونا پڑا۔ تو وہ ڈر گئی۔ اور اس نے کہا ــــ

پیارے ڈنو ہے، تم اس قدر تشویشناک انداز سے ڈر کیوں رہے ہو؟ تمہاری

ہتھیلی پر شبنم کا سا پسینہ کیوں آ گیا ہے؟ میں تھک گئی ہوں مجھے جلد بتاؤ کہ وہ بوڑھا کون تھا؟ مجھے اُس کے خدوخال تو اچھی طرح یاد نہیں لیکن لائی شس! تم اُس کی بے پناہ آنکھوں سے شرما کیوں گئے؟

لائی شس نے جواب دیا ــــــ

"وہ اپولونیس فلاسفر تھا۔ میرا معتبر رہنما۔ ایک بہترین معلّم لیکن آج تو وہ اہرمن کی اولاد کا کوئی عفریت معلوم ہوتا تھا جس نے میرے سہانے خوابوں کو پریشان کر دیا ــــــ!"

وہ یہ کہہ رہا تھا کہ وہ ایک ستونوں والی ڈیوڑھی میں پہنچ گئے جس کا مدخل بڑا وسیع اور بلند تھا۔ باہر ایک سیمابی قمقمہ جگمگا رہا تھا جس کی طلعت زا ہلکی روشنی مرمریں سیڑھیوں پر اس طرح منعکس ہو رہی تھی جس طرح پانی میں ستارے لرزش پیدا کر رہے ہوں۔ سنگِ مرمر کا رنگ ایسا پاکیزہ اور مصفّا تھا کہ اس میں سنگ اسود کی سیاہ دھاریاں، شفّاف سیّال مادے پر ابھرے ہوئے دانوں کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔ فرشتوں کے سوا کسی نے بھی اس جگہ بسیرا نہ کیا تھا۔ جونہی وسیع کواڑ کے کھلنے سے ایک خفیہ جگہ برآمد ہوئی وہاں سے عیولین (ہوا کی دیوی) کے ترنم کی ایک آواز نکلی۔

یہ مقام پوشیدہ تھا۔ اور اسے سوا دو پنبہ دہن ایرانی غلاموں کے جو اُسی سال بازاروں میں دیکھے گئے۔ کوئی نہ جانتا تھا اور نہ کسی کو علم تھا کہ وہاں کون رہتا ہے۔ بعض تجربہ پسند لوگوں نے ان کا تعاقب بھی کیا تھا لیکن وہ کھوج لگانے میں ناکام رہے۔

اب کئی رجائیت پسند طبیعتیں چاہیں گی کہ اِن دونوں عاشقوں کو دنیا کے شور و غوغا سے دور اسی خفیہ جگہ میں چھوڑ دیا جائے لیکن شاعری جو ہمیشہ حقیقت کی متلاشی

رہتی ہے۔اُس وقت تک دم نہ لے گی۔جب تک اُس بھیانک منظر کا نقشہ نہ کھینچ لے جو ان کی تقدیر میں زمانہ قریب ہی میں لکھا ہوا تھا۔

حصّہ دوم

اے محبّت کے دیوتا ـــــ کامدیو ـــــ ہمیں معاف کرنا۔اگر ہم کہیں کہ وہ محبت جو ایک جھونپڑے میں جہاں پانی اور سوکھی روٹی کے سوا کچھ نہ ہو۔کی جائے۔محض فضول ہے۔بے سود ہے،بے فائدہ ہے۔لیکن وہ محبّت جو ایک ایوانِ قصر میں کی جائے غالبًا کسی زاہدِ مرتاض کی ریاضت سے بھی زیادہ اندوہ ناک ہے۔یہ پرستان کا ایک غیر مصدقہ اصول ہے۔اور جسے عشق و محبت سے لگاؤ نہ ہو۔وہ اُسے سمجھنے سے بالکل قاصر رہے گا۔

اگر لائی شمس اپنی سرنوشت سنانے کے لئے زندہ رہتا۔تو وہ اس اخلاقی تجربہ کے ردوبدل میں ہرگز پس و پیش نہ کرتا۔لیکن نفرت و حقارت کے جذبات جو محبت کی نرم آواز کو کرخت بنا دیتے ہیں ـــــ پیدا کرنے کے لئے ان کی خوشی اور مسرت کا زمانہ بہت تھوڑا تھا۔اور اس کے علاوہ عشق کا دیوتا ہر شب اپنی خوفناک چمک کے ساتھ ان کے کمرے کے دروازے پر حاسدانہ انداز میں منڈلاتا اور اپنے بازوؤں کو پھڑپھڑاتے ہوئے ان کے کمرے کی چوکھٹ پر روشنی ڈالتا تھا۔باوجود ان سب باتوں کے تباہی و بربادی کا زمانہ آ ہی گیا ـــــ!

وہ ایک روز تیسرے پہر کے وقت صوفے پر بیٹھے تھے۔جہاں روزمرّہ کے آرام نے

اُن کیلئے اس نشست کو مانوس کر دیا تھا۔ وہ ایک منقش پردے کے نیچے بیٹھے تھے۔
جس کی رِدا ہوا کی طرح مہین تھی۔ اور جو ایک سنہری تاگے سے لٹکا ہوا ہوا کے جھونکوں سے کمرے میں لہرا رہا تھا۔ باہر دو مرمریں ستونوں کے درمیان صاف و شفاف نیلگوں آسمان نظر آ رہا تھا۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں ـــــ تاہم اس خیال سے کہ وہ سوئے ہوئے بھی ایک دوسرے کے جلوے سے بہرہ ور ہو سکیں۔ وہ نیم وا تھیں ـــــ

اچانک ـــــ سامنے کی پہاڑی سے انہیں ایک طبلے کی آواز سنائی دی جس کی شور انگیز دھمک میں طنبور کی نغمہ سرائیاں بھی دب کر رہ گئیں ـــــ!

لائی شمس چونکنا ہو گیا۔ آواز ماند پڑ گئی۔ لیکن اُس کے دماغ میں ایک سنسناہٹ چھوڑ گئی ـــــ!

جب سے وہ اُس پُر معصیت، خوشگوار گناہوں کی ارغوانی دُنیا میں داخل ہُوا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس کی رُوح محبت کی زمردیں حدود سے نکل کر دنیا کی پُر شور آبادیوں میں آئی۔ جن کو وہ مدّت سے خیر باد کہہ چکا تھا ـــــ!

وہ عورت جو دور اندیش اور رمز شناس تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اور اُس نے خیال کیا کہ لائی شمس کو شاید کسی مزید شئے کی حاجت ہے جو اُس کی مسرت کا خزانہ اُسے مہیّا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اِس لئے اس نے بھانپ لیا۔ کہ لائی شمس اس کے علاوہ کسی اور چیز کے متعلق سوچ رہا ہے۔ اور وہ جانتی تھی کہ کسی غیر شئے کا تصوّر کرنا اس کی محبّت کی موت کا نقّارہ ہے۔

لائی شمس نے آہستہ سے پوچھا:۔
"پیاری تم آہیں کیوں بھر رہی ہو؟"

اس نے جواب دیا:-

"تو پھر تم سوچتے کیا تھے؟ ـــــ تم نے مجھے ترک کر دیا ـــــ اب میں کہاں ہوں!
تمہارے دل میں تو یقیناً نہیں ـــــ کیونکہ تمہاری مژگاں پر آزردگی کے بادل چھائے
ہوئے ہیں۔ اور میں تمہارے دل سے تہی دامن۔ بے خانماں و برباد جا رہی ہوں۔

ہاں۔ ہاں! یہ ضرور ایسا ہی ہے ـــــ!"

اس نے لبھیہ کی روشن آنکھوں کے سامنے جھکتے ہوئے جہاں وہ اس ننھی سی
فردوس گاہ کی مرأت میں منعکس ہو رہا تھا ـــــ یہ جواب دیا ـــــ:

میرے نقرئی ستارے صبح کے بھی اور شام کے بھی تم فرقت کے خیال میں اس
قدر پژمردہ کیوں ہو رہی ہو۔ جبکہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کس طرح میں اپنے دل کی دنیا کو
گہری محبت سے جس میں اضطراب کی چاشنی بھی ہو آباد کر لوں اور تمہاری رُوح کو اپنی رُوح
کے ساتھ عشق کی مزید زنجیروں سے جکڑ لوں۔ پھانس لوں اور اسیر کر لوں۔ اور ایک ناشگفتہ
کلی کی خوشبو کی طرح اپنے دل کی گہرائیوں میں اُسے محبوس کر لوں ـــــ ہاں ذرا مجھے
اپنا بوسہ لینے دو ـــــ تم اپنے چہرے پر رنج کا اثر دیکھتی ہو؟

میرے خیالات؟ کیا میں ان کا انکشاف کردوں تو پھر سنو جب ایک انسان کے
پاس کوئی بیش بہا خزانہ ہو اور وہ اس سے ایک عالم کو محوِ حیرت بنا سکتا ہو تو اس کے لئے ضروری
ہے کہ وہ بازاروں میں اس چیز کو لے جا کر اس کی تشہیر کرے ـــــ جیسا کہ میں کرنا چاہتا
ہوں اور میری آرزو ہے کہ تجھ کو ایک عروسی رتھ میں بٹھا کر قرنطیہ کے پر رونق بازاروں میں
سے ہو کر گذر جاؤں۔ تاکہ جو میرے دوست ہیں۔ وہ مدح و توصیف کے گیت گائیں۔ اور
جو دشمن ہیں۔ وہ آتشِ رقابت میں جل مریں ـــــ!"

عورت کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ وہ بولی تو نہ لیکن پژمردہ خاطر ہو کر حلیمانہ انداز میں اٹھی ،اور لائی شس کے قدموں پر گر کر اشکوں کا ایک دریا بہا دیا۔ اور نہایت لجاجت سے اس کے آگے درخواست کی کہ وہ اپنا ارادہ بدل دے (اس اثنا میں وہ اس کے ہاتھوں کو گرماتی رہی)

لائی شس کو اس سے از حد صدمہ ہوا لیکن اب اُسے ایک ضد سی ہو گئی تھی۔ اور اپنے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس نے اپنی تمام تر قوتیں صرف کر دینے کا پورا فیصلہ کر لیا۔ نیز باوجود اُس بے پایاں محبت کے جو وہ اپنی ہم صنف کے بارے میں اپنے دل میں جاگزیں کئے ہوئے تھا۔ وہ اس کے رنج و الم میں ایک قسم کا حظ محسوس کرتا تھا —— اس کی خواہش اور بھی تیز ہو گئی۔ اور غیظ و غضب نے ایک ایسے آدمی کی ابروؤں پر جس کی جبیں پر کبھی کوئی شکن نہ پڑا تھا۔ ایک وحشیانہ رنگ اختیار کر لیا۔
غصّہ فرو کرتے وقت اس کا چہرہ اپالو کے چہرے کی طرح حسین ہو گیا۔ جب وہ ایک سانپ کو مار رہا تھا —— ہشت! سانپ؟ —— کہیں وہ سانپ تو نہیں تھی؟ ...
اس کے جسم میں محبت کی آگ سلگ رہی تھی۔ اور وہ استبداد و ظلم کو پسند کرتی تھی۔!
چنانچہ جب یہ معاملہ دب گیا تو وہ برات لانے پر رضامند ہو گئی ——!
رات کی خاموشیوں میں اس نوجوان نے یوں سرگوشی کی۔
"تمہارا کوئی پیارا نام ہوگا۔ اگرچہ میں نے تمہیں ایک آسمانی رُوح تصوّر کرتے ہوئے جیسا کہ میں اب بھی کرتا ہوں تم سے کبھی تمہارا نام دریافت نہیں کیا لیکن کیا اس من موہنی صورت کا کوئی فانی نام بھی ہے۔ اور کیا اس شادی خانہ آبادی پر مبارک باد دینے کے لئے تمہارے کوئی رشتہ دار یا دوست بھی ہیں۔؟"

لیمیہ نے افسردگی سے جواب دیا:-

"میرا کوئی دوست نہیں —— ایک بھی نہیں —— قرطبہ میں میری موجودگی کا مشکل کسی کو علم ہوگا۔ میرے والدین کی شکستہ استخواں مٹی میں مل چکی ہیں۔ اور ان کے مزاروں پر ایک شمع بھی روشن نہیں ہے۔ وہ اپنی بدنصیب قوم کا حال دیکھ کر جاں بحق ہو گئے تھے۔ صرف میں اس کی ملطبی رہ گئی ہوں۔ اور میں بھی تمہاری وجہ سے ان کی قبر پر ضروری رسومات بھی ادا نہیں کر سکتی جیسے تمہاری خواہش ہے مہمانوں کو بلا لو، لیکن ایسا بھی اگر تم مجھ پر کوئی مہربانی کرنا چاہتے ہو تو اس بوڑھے پلونیس کو مت بلانا۔ اس سے مجھے پوشیدہ ہی رکھنا!"

لائی شمس یہ عجیب و غریب الفاظ سن کر سخت حیران ہوا اور اس سے اس کی وجہ پوچھی لیکن وہ گھبرا گئی۔ اور سونے کا بہانہ کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اسے بھی اپنے جادو کے زور سے نیند کے دھندلکوں میں غائب کر دیا۔

اس زمانے کی رسم تھی کہ شفق کی گلکاریوں کے وقت دلہن کو ایک پردے دار گاڑی میں بٹھا کر پھرایا جاتا تھا۔ اس کے آگے پھولوں کی سیجیں بچھا دی جائیں۔ اور شمع بردار شادی کے نغمے گاتے ہوئے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور جشن منائے جاتے تھے۔

لیکن اس بیچاری کا کوئی دوست نہ تھا۔ جب وہ اکیلی رہ گئی (کیونکہ لائی شمس اپنے رشتہ داروں کو بلانے بیٹھ گیا تھا) اور اس نے سمجھ لیا کہ وہ لائی شمس کو اپنے احمقانہ ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتی تو وہ اس سوچ میں پڑ گئی کہ اپنی آرائش کس طرح کرے اور کیسے اپنی کبیدہ خاطری کے باوجود اس عظیم الشان جشن کو منانے کے لئے مناسب حال تیاریاں کرے۔

بعد میں اس نے یہ سب کچھ کیا لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے خفیہ کارگزار کیسے

اور کہاں سے آئے تھے۔

ہال کمرہ اور دروازوں کے اندر اور باہر پروں کی پھڑپھڑاہٹ سُنائی دے رہی تھی۔ اور چند ہی لمحوں میں حجلۂ عروسی مزیّن ہو کر آب و تاب سے چمکنے لگا۔ ایک سحر انگیز نغمہ جس پر تمام فسوں کاری کا انحصار تھا کمرے کے اندر گونج رہا تھا مبادا کہ وہ ساری سحر آفرینی بیک لمحہ ناپید ہو جائے۔

یہ نو بہ نو چوب کاری ایک وادیٔ دلفریب کی نقل تھی جس میں انار اور کھجوروں کے درخت قطار اندر قطار لگے ہوئے تھے۔ دو دو انار اور دو دو کھجوروں کے درخت سڑک کے دونوں طرف سے آکر عین وسط میں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے تھے جس کے زیریں ایک پھولوں سے اٹی ہوئی روش تھی عشق پیچاں کی بیل بڑے درختوں کے ساتھ منڈھی ہوئی تھی۔ اور ان کے نیچے قمقموں کی ایک سیمابی رَو جگمگا رہی تھی۔ درختوں کے عین درمیان مرمریں بخوردانوں میں عود و عنبر جل رہا تھا۔ اور ایک منقش شامیانے کے نیچے خوشبو دار کھانے چنے تھے۔

لیمیہ لباسِ فاخرہ زیب تن کئے شباب کی صاعقہ پاشیاں کرتی ہوئی ادھر اُدھر مصروف تھی۔ وہ شگفتہ لیکن افسردگی کے عالم میں ڈوبی ہوئی اپنے نادیدہ کارکنوں کو عمارت کے کونے کونے اور چپّہ چپّہ کو سجانے اور مزیّن کرنے کی ہدایات کرتی پھرتی تھی۔

آخر اس نے سب کام پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور خود کمرے کو بند کر کے اس میں ساکت و صامت ہنگامہ پرداز مہمانوں کا انتظار کرنے لگی۔ جو تھوڑی دیر ہی میں آکر اُس کی خاموشی میں مخل ہونے والے تھے۔

آخر وہ وقت آپہنچا۔ اور سب مہمان خوش گپیاں اڑاتے آ گئے۔

اے کوتاہ اندیش لائی شنس! دیوانے!! تجھے کیا سوجھا تھا کہ تو اپنی قسمت کے خاموش لمحات کو در یا بُرد کرتے ہوئے اُن پوشیدہ آرام گاہوں کی تشہیر کر رہا تھا!

آنے والے مہمانوں کا دماغ مصروف تھا۔ اُن میں سے ہر کوئی حیرت و استعجاب کے سمندر میں مستغرق دروازے میں انگشت بدنداں داخل ہوا۔ کیونکہ وہ اس بازار سے بچپن کے زمانے ہی سے آشنا تھے۔ اور انہیں علم تھا کہ وہاں کوئی چٹیل میدان نہ تھا۔ اور نہ کبھی انہوں نے اس جگہ کوئی عالی شان عمدہ ساخت کی عمارت دیکھی تھی۔

تعجب خیز اور استفسار انگیز آنکھوں سے اس فسوں کاری کا مشاہدہ کرتے ہوئے وہ سب جلدی سے اندر داخل ہوئے۔ سوا ایک کے جو کڑی نگاہوں سے دیکھتا ہوا نپے تُلے قدموں کے ساتھ چل رہا تھا ——— !

یہ الیونیس تھا کسی چیز پر اُسے ہنسی آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے کوئی پیچیدہ مسئلہ درپیش ہے۔ اور اس وجہ سے اُس کے دل کو سکون میسّر نہیں ہے۔

لیکن اب اس نے گتھی سلجھا لی تھی ——— یہ اُس کی پیش اندیشی کے عین مطابق تھا۔

وہ پُرشور طالار میں داخل ہوا اور جا کر اپنے نوجوان شاگرد سے ملاقات کی۔ اور اس سے یوں گویا ہوا:۔

لائی شنس یہ وضعداری کے تو خلاف ہے۔ کہ ایک ناخواستہ مہمان یوں بے دھڑک یہاں گھس آئے۔ اور خوش رو نوجوان دوستوں کے زمرے میں نہایت

بدتہذیبی سے آکر شامل ہو جائے۔ لیکن تاہم میں اس غلطی کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ اور تم مجھے معاف کر دو گے۔"

لائی شئس شرما گیا۔ اور عذر خواہی کرتا ہوا اور بوڑھے کی ناراضی کو حلاوت آمیز باتوں سے فرو کرتا ہوا اُسے ایک وسیع چوپٹ دروازے میں سے اندر لے آیا۔

حجلۂ عروسی بوقلموں رنگینیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اور اس میں ایک عطر بیز نکہت بھری ہوئی تھی۔ بلوریں لگنوں میں عود و عنبر سلگ رہے تھے۔ جن میں سے شمیم زا معطّر دھواں نکل رہا تھا۔ لگنوں کو چند مقدّس تپائیاں تھامے ہوئے تھیں۔ جن کی مہین ٹانگیں خوشنما اونی قالینوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ دھوئیں کے پچاس سنبلیں حلقے پچاس ہی شمعدانوں میں سے اُٹھ اُٹھ کر سوئے سقفِ بلند رواں تھے۔ اور سامنے کے آئینوں میں انہی عنبر فشاں بادلوں کا دہرا عکس لرزش کر رہا تھا۔ بارہ بیضوی میزیں جن کے بالمقابل انسانی سینے کی بلندی تک بارہ ہی گول ازرق نشستیں تھیں۔ ایک خُرّش کے چُنگل پر قرینہ سے منضبط تھیں۔ میزوں پر صدف کے بلوریں ساغروں میں مئے گلگوں چھلک رہی تھی۔ اور سیرس کے سینگوں میں سما جانے والے اثمار سے بھی سہ گنا پھل چنے تھے۔ اور قریب ہی بڑے بڑے میناؤں میں شوخ، چمکیلی شراب ناب جو کسی میکدۂ غنیفہ سے لائی گئی تھی۔ دیکھنے والوں کی نظر نوازی کر رہی تھی۔ ان سب ماکولات و مشروبات کے درمیان دیوتاؤں کی ایک ایک مورتی لبطور زینت و زیارت کے رکھی ہوئی تھی۔

طالار میں ہر شخص کے ہاتھ پاؤں پر حسین مغبچوں نے آبِ خنک کے اسپنج نچوڑے اور ان کے بالوں میں خوشبودار تیل ڈالا۔ پھر سب کے سب کھانے کے کمرے میں سفید لباس پہنے چلے گئے۔ اور اس دولت و امارت کے مبدأ و ماخذ پر غور کرتے ہوئے حریری گدیلوں پر ترتیب وار بیٹھ گئے۔

ہوائیں نرم رو موسیقی کو سن رہی تھی۔ اور جہان جب تک شراب نہ پی تھی، آہستہ آہستہ یونانی زبان میں گفتگو کرتے رہے۔ لیکن جب خوشبودار انگبین نے ان کے دماغوں کو تر کیا تو وہ بلند آواز . . . سے باتیں کرنے لگے۔ اور اس کے ساتھ ہی موسیقی کی تانیں بھی زیادہ بھاری اور تیز ہو گئیں۔

وہ محل ساز و سامان کی شان و شوکت۔ مرصع چھت۔ نئے گلگوں حسین غلمان اور لیمبیہ خود (شراب کے خوشگوار اثر کے تحت جب انسان ہر چیز سے آزاد ہو جاتا ہے) اب کوئی تعجب خیز چیزیں نہ رہیں۔ کیونکہ لذیذ اور دل پسند شراب کے آگے جنتِ فردوس بھی کوئی اجنبی شئے نہیں رہتی ——— !

اب ربۃ النفوس شراب اپنے عروج پر تھی۔ ان کے رخسار لالہ فام ہو گئے۔ اور ان کی چمکیلی آنکھیں پہلے سے زیادہ روشن ہو گئیں

اس کے بعد ہر قسم کے ہار جو تمام وادیوں اور جنگلوں کے خوشبودار پھولوں اور پودوں کی ٹہنیوں سے گندھے گئے تھے۔ لبالب بھری ہوئی ٹوکریوں میں لائے گئے تاکہ ہر جہان اپنے خیالات اور اپنے مذاق کے مطابق ان میں سے ایک کا اپنے لئے انتخاب کر سکے۔

لیمبیہ کے لئے کونسا ہار ہو؟ اور رلائی شمس کے لئے کونسا؟ اور اس بوڑھے

فلاسفر ایلونیس کے لئے کونسا؟

لیمیہ کی دمکتی پیشانی پر تو ہمارے خیال میں بید مجنوں کی پتیوں اور ناگ بوٹی کا ہار ہو۔ اور اس نوجوان کے لئے انگور کی بیلوں کا۔ تاکہ اس کی چوکنی آنکھوں میں اور زیادہ کثیف وسکر چھا جائے۔ اور اس بوڑھے فلاسفر کو تیز بھالے کی طرح نوکوں والی گھاس اور زہریلے اونٹ کٹارے کا گوندھا ہوا ہار دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ اس کی کنپٹیوں پر جاکر جنگ آزمائی کرے۔

کیا روکھے فلسفہ کے سامنے تمام رعنائی عنقا نہیں ہو جاتی؟ آسمان پر ایک زمانہ گذرا۔ قوس قزح کے نام سے ایک چیز تھی۔ اب ہم اس کے اجزائے ترکیبی اور ماخذ کو جانتے ہیں۔ اس لئے وہ ایک عام شے بن کر رہ گئی ہے فلسفہ تو فرشتوں کے پر بھی کتر لیتا ہے۔ اور قوانین وضوابط کی رو سے فضا کو جنوں اور چڑیلوں سے پاک وصاف کیا جا سکتا ہے۔ اور تیرہ نشین بھوتوں کو چشمک برق میں کیفر کردار تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح لیمیہ کا بھی تجزیہ کر دیا گیا۔ اور وہ ایک لمحہ میں سایہ بن کر ڈھل گئی۔

لائی شس لیمیہ کے قریب مسرور بیٹھا تھا۔ اور اس کا دھیان اپنی معشوقہ کے سوا کمرے کی کسی اور صورت کی طرف نہ تھا۔

آخر اس نے اپنی محویت کے عالم کو توڑا۔ اور ایک لبالب جام اٹھایا۔ پھر اس نے میز کی دوسری جانب نگاہ ڈالی۔ تاکہ اپنے اُستاد کی صحت کا جام نوش کرے۔ کیا دیکھتا ہے کہ گنجی چندیا والے فلاسفر کی آنکھیں عروس کے حُسن خوفزدہ پر نہایت بے رحمی سے جمی ہوئی ہیں۔ اور وہ اس کی طرف متواتر دیکھ

رہا ہے۔

لائی شمس نے زور سے لبمیہ کا ہاتھ دبایا لیکن وہ پیلی زرد ہو کر صوفے پر نڈھال پڑی تھی۔ اس کا ہاتھ برف کی مانند سرد تھا۔ اور اس کی شریانوں میں آبِ خنک رواں تھا۔ پھر فوراً ہی اس کا ہاتھ گرم ہو گیا۔ اور اس غیر معمولی گرمی کی شدت لائی شمس کے سینے میں آ کر گولی کی طرح لگی۔

"لبمیہ یہ کیا بات ہے؟ ڈرتی کس سے ہو؟ کیا تم اس آدمی سے واقف ہو؟"

لبمیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

لائی شمس نے اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑ دیں۔ لیکن ان میں اس کی والہانہ محبّت کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے زیادہ غور کے ساتھ دیکھا۔ اور متواتر دیکھتا چلا گیا۔ لیکن انسانی حواس لڑکھڑا گئے۔ کوئی سحر حریص اس کے حُسن کو چُوس رہا تھا۔ اس کی ہتیلیوں میں قوتِ امتیاز بھی مفقود ہو رہی تھی۔

"لبمیہ!" اس نے چیخ کر بلایا لیکن جواباً کوئی نرم آواز نہ آئی۔ لوگوں نے اس چیخ کو سُنا۔ اور عیش و عشرت کی آوازیں بند ہو گئیں۔ کئی نازک پتیاں ہاروں میں خشک ہو گئیں۔

آہستہ آہستہ انسانی آوازیں، موسیقی اور خوشی و مسرّت کی تانیں سب بند ہو گئیں۔ ایک شہرِ خاموشاں کا سا بھیانک سکوت بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ وہاں ایک ہُو کا عالم طاری ہو گیا۔ اور ہر شخص کے رونگٹے خوف کے مارے کھڑے ہونے لگے۔

"لبمیہ" لائی شمس نے پھر چیخ کر بلایا۔ لیکن سوا ایک بازگشت کے کوئی آواز نہ

اس بھیانک سکوت میں مخل نہ ہوئی۔

"دور ہو جا، اے فسوں کاری"! لائی شمس پھر چلّایا۔ اور لیمیہ کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن وہاں اب کنپٹی پر کوئی نیلگوں رگ موجود نہ تھی۔ نہ کوئی رخسار پر سرخی کی جھلک تھی اور نہ آنکھوں میں جواب اندر دھنس گئی تھیں۔ کوئی روشنی ہی تھی ـــــــ آنکھیں بے نور ہو گئیں اور لیمیہ ایک بے جان لاشے کی صورت کرسی پر بیٹھی تھی۔

بند کر، بند کر، اپنی سحر انگیز آنکھیں۔ او بے رحم! دور کر انہیں نا ہنجار ورنہ اُن تمام دیوتاؤں کی لعنتیں جن کی مورتیاں یہاں ان کی ظلّی موجودگی کی آئینہ دار ہیں تجھ پر پڑیں گی۔ اور تجھے نہایت ایذا رسانی کے ساتھ اندھا کرتے ہوئے تیرے ضمیر کو اس قدر کمزور بنا دیں گی کہ تو حرماں نصیب ہو کر واصلِ جہنم ہو گا۔ اور یہ سب کچھ بدلہ ہو گا تیری اُن کذب بیانیوں کا، تیری ناجائز سحر کاریوں کا اور تیری اُن فلسفہ بازیوں کا جو تو دیوتاؤں کی طاقت و جبروت کے علی الرغم اور ان کی ناراضی سے بے پروا ہو کر کرتا رہا ہے۔

"قرنطینو! اس بوڑھے بدمعاش کی طرف دیکھنا ـــــ دیکھنا کہ اُس کی آنکھوں کے اوپر کس طرح اس کی بے بال پلکیں تنی ہوئی ہیں"۔

"بے وقوف" فلاسفر نے ایک حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ نرم آواز میں کہا۔ جس کا جواب لائی شمس نے ایک موت کی طرف قریب لے جانے والی کراہ کے ساتھ دیا۔ اور خود بے ہوش ہو کر لیمیہ کے جاں بلب جسم کے ساتھ جا گرا۔

"بے وقوف! بے وقوف!" فلاسفر نے پھر دہرایا۔ اور اُس کی آنکھوں میں ابھی

کوئی جنبش پیدا نہیں ہوتی۔ زندگی کے تمام دکھوں سے میں نے تجھے آج تک محفوظ رکھا۔ اور کیا تجھے اب میں ایک سانپ کا شکار ہونے کی اجازت دے سکتا ہوں"؛

لیمیہ نے موت کی آخری ہچکی لی۔

فلاسفر کی آنکھیں ــــــ نشتر کی طرح تیز، ظالم، متجسس اور زہریلی اس کے جسم کے ریشہ ریشہ میں گھس گئیں۔ لیمیہ نے حتی المقدور اپنے کمزور ہاتھ سے فلاسفر سے خاموش رہنے کی درخواست کی۔

لیکن وہ اپنی غیر متحرک آنکھوں سے بدستور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"سانپ"! اس کی آواز کمرے میں گونجی۔

جونہی اس نے کہا۔ ایک ہولناک چیخ کے ساتھ وہ غائب ہوگئی۔ اور ساتھ ہی لائی سئس کا پہلو خوشی و مسرت سے خالی رہ گیا۔ وہ ایک صوفے پر دراز تھا۔ اس کے دوست آئے۔ اُسے سہارا دیا۔ لیکن اس کی نبض ساقط تھی۔ اُس کا تنفس بند تھا۔ اور شادی کے لباس میں ایک بے جان جثہ وہاں پڑا ہوا تھا!

جامِ ریحان

احسان علی شاہ بی۔اے

کیٹس ایک محبت کرنے والا دل لے کر پیدا ہوا تھا۔ اور اسے ہر اُس ذی روح سے ہمدردی تھی جس میں محبّت کرنے اور محبت کے لئے اپنی ساری زندگی کو آنسوؤں میں بدل دینے کی صلاحیت موجود ہو۔ ازابیلا بھی شدید محبّت کرنے والی عورت تھی۔ اور اس میں محبّت کے لئے سب کچھ کر گذرنے کا مادہ موجود تھا۔ کیٹس نے ان تمام صفات کو بیک نظر دیکھ لیا اور ان کے چاروں طرف تخیّل کا ایک عظیم الشّان قلعہ تعمیر کر لیا۔ جو اس وجد آفرین نظم کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش ہوا۔

اس نظم کا اصل ماخذ بوکیشیو کی ایک کہانی ہے۔ کیٹس نے بوکیشیو کی ازابیلا میں اپنا دل رکھ دیا اور اُسے حزن کی دیوی بنا دیا۔ مقتول عاشق کے لئے ازابیلا کا شدید غم بذاتِ خود ایک درد آفرین شعر کی حیثیّت رکھتا تھا۔ اس پر کیٹس کے فلک پیما تخیّل نے گلکاریاں کیں۔ اور محبّت کے اس نادر مجسّمہ کو اتنا جاذبِ نظر بنا دیا کہ ہر دیکھنے والا اُس سے بے ساختہ ہمدردی کرنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔

جذبات کی شدّت۔ زورِ بیان اور رفعتِ تخیّل اس نظم کی قابلِ ذکر خصوصیات ہیں۔

حسین اور سادہ دل ازابیلا اور عشق کے بیت المقدس کا ایک نوجوان راہب لورینزو ایک ہی حویلی میں رہ کر اپنے نازک دلوں کی پرکیف دھڑکنوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ وہ جب تک اکٹھے کھانا نہ کھالیتے ان کے لئے دسترخوان پر بیٹھنا ناممکن تھا۔ وہ ایک چھت تلے رہتے ہوئے اس وقت تک نیند سے ہمکنار نہیں ہو سکتے تھے جب تک ایک دوسرے کی یاد میں آنسو نہ بہالیں۔

ہر صبح بلند ہونے والا آفتاب ان کی محبت کو پہلے سے وہ چند پاتا۔ اور شام کا پہلا ستارہ اس محبت کو اور بھی گہرا اور پُرخلوص دیکھتا۔ لورینزو خواہ گھر میں ہو خواہ کھیتوں میں۔ ازابیلا کا پیارا سراپا ہر وقت اس کی آنکھوں تلے پھرتا رہتا۔ اور لورینزو کی پُرکیف تانیں ازابیلا کے لئے درختوں کی زخم آفرینیوں اور پُراسرار بانسری کی شیریں نوازیوں سے کہیں زیادہ رُوح پرور اور کیف بار تھیں۔

اس سے پہلے کہ دروازہ کھول کر اس حُسنِ مجسّم کو اپنی پیاسی آنکھوں کی آغوش میں لے لے۔ لورینزو سمجھ جاتا تھا کہ کس کا نرم و نازک ہاتھ دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ وہ عقاب جیسی تیز نظروں سے اس کے چہرے کو کھڑکی میں دیکھ لیتا۔ اور جب وہ حسین چہرہ آسمان کی طرف اُٹھتا۔ تو وہ بھی آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ صبح کے وقت اس کے قدموں کی مترنم چاپ کو سیڑھیوں پر سُننے کی بے قراری میں وہ تمام رات انگاروں پر لوٹتا رہتا۔

مئی کا طویل مہینہ اسی ذہنی انتشار میں گذر گیا۔ اور آغاز جون نے ان کے حسین چہروں پر مردنی دیکھی۔ لورینزو تکئے سے مخاطب ہو کر کہتا "کل میں اپنی مسرت کے سامنے سجدہ کروں گا ——— کل میں اپنے دل کی مالکہ سے بھیک مانگوں گا" اور ازبیلا عالم خواب میں کہتی "لورینزو! اگر تمہارے ہونٹ محبت کا راگ نہ الاپیں۔ تو مجھے دوسری شام دیکھنی نصیب نہ ہو"

لیکن صد حیف کہ ان کے تلخ دن اسی طرح گذرتے گئے ——— یہاں تک کہ گلاب کے سائے میں رہنے کے باوجود ازبیلا کے شاداب رخسار مرجھا گئے۔ اور مامتا کی ماری ماں کے گالوں کی طرح سوکھ گئے۔ جو میٹھی لوریوں میں اپنے بچّے کے درد و کرب کا علاج ڈھونڈتی ہے۔ "ازبیلا کتنی پژمردہ معلوم ہوتی ہے"؛ لورینزو سوچتا "مجھے کچھ کہنا تو نہ چاہیئے۔ لیکن میں سب کچھ کہوں گا۔ اور صاف لفظوں میں اپنے دل کی رام کہانی کہوں گا۔ میں محبت کی ان غماز آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ پی لوں گا۔ کم از کم اس سے اس کے دل کی الجھنیں دور ہو جائیں گی"؛

ایک حسین صبح کو یہ خیال لورینزو کے ذہن میں آیا۔ اور تمام دن اس کا دل بے پناہ شدت سے دھڑکتا رہا۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہا۔ کہ اسے بات کرنے کی طاقت مل جائے۔ لیکن اس کے باوجود سرخی کی لہر اس کا گلا دبا دیتی۔ اور اس کی نبضیں چھوٹ جاتیں۔ ازبیلا کو بیوی بنانے کا بے باک تصور اسے بچے سے بھی زیادہ نرم بنا دیتا۔ اُف! محبت کی طوفان انگیزیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔

ایک اور کرب انگیز رات کروٹیں بدل بدل کر گذر گئی۔ اور صبح کے وقت ازبیلا کی عقابی نگاہوں نے اس کی وسیع پیشانی کی گہری سلوٹوں میں رنج و غم کے

ایک ایک نشان کو دیکھ لیا۔ پہلے وہ مردہ انسانوں کی طرح زرد معلوم ہوتا تھا۔ پھر ایک دم اس کا چہرہ شرم و حیا کی سُرخی سے مے گوں ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ازبیلا نے نہایت شیریں لہجے میں کہا: "لورنیزو!" اور پھر یہ طوفانی جذبہ یک دم نسائی حجاب میں چھپ گیا۔ لیکن اس کا طرزِ تکلم اور اس کی نگاہیں وہ سب کچھ کہہ گئیں، جو اس کے دل میں تھا۔

"ازبیلا میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میری دُکھ بھری کہانی تمہارے کانوں تک پہنچنے کے قابل ہو گئی ہے۔ اگر تم نے کبھی دنیا کی کسی چیز پر اعتماد کیا ہے تو تمہیں اسی کا واسطہ! یقین جانو کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میری رُوح آخری فیصلہ سننے کے لئے بے قرار ہے۔ میں تمہارے نازک ہاتھوں کو دبا کر تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔ اور نہ ہی ان مخمور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سحر طراز نظروں کو خوفزدہ بنانا چاہتا ہوں لیکن ایک اور رات کاٹنا میرے لئے ناممکن ہے۔ میرا جوشِ جنوں کسی طرح بھی کم نہیں ہو سکتا۔ ———— میری رُوح! تم مجھے سرما کی تلخیوں سے دور لئے جا رہی ہو۔ محترم خاتون! تمہاری موجودگی میرے ذہن میں احساسِ بہار کو زندہ کر دیتی ہے۔ میں اس پھول کو سونگھ کر رہوں گا جس کی پنکھڑیاں کیف بار صبح کے آغوش میں کھلتی ہیں۔" اس کے ہونٹ جو آج تک خاموش رہے تھے، بے باک ہو گئے۔ اور اس کے یاقوتی ہونٹوں سے ہم آہنگ ہو کر شعریت کی لطیف شبنم برسانے لگے۔ روحانی مسرت ان دونوں کی ہم رکاب تھی۔ اور انبساط جون کے گرمجوش میں کھلنے والے پھول کی طرح بڑھ رہا تھا۔

جب وہ جدا ہوئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو نوام پھول چند لمحوں کے لئے جدا

ہوئے ہیں" تاکہ پھر مل کر ایک دوسرے کی روحانی لطافتوں میں کھو جائیں۔ ازبیلا جو رتبۂ حسن کی طرح باوقار اور حسین معلوم ہوتی تھی۔ دلکش محبت اور رادھے دیوتا کے نغمے الاپتی کمرے میں چلی گئی۔ اور لورینزو خوشی سے ناچتا اور اچھلتا ہوا غروب آفتاب کی آخری کرنوں کو پہاڑیوں کے اردگرد طلائی ہار کی طرح لپٹا ہوا دیکھنے کے لئے چلا گیا۔

جب شام کا دھندلکا ستاروں کے حسین چہروں پر سے نقاب اٹھاتا۔ اس وقت یہ دونوں ملتے ——— یہ دونوں سنبل اور سفید گلاب کے جھرمٹ میں دوسری دنیا اور بدنامی کی لرزتی ہوئی زبان سے بے پرواہ ہو کر ملتے۔ کاش یہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح کیف بدوش رہتے۔ اور اُن کی دکھ بھری کہانی دنیا کے حمقوں کیلئے اکتساب مسرت کا ذریعہ نہ بن جاتی!

تو وہ رنجیدہ تھے؟ البتہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ ان ہستیوں کے لئے جن کے کارنامے سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ہم آنسوؤں کے دریا بہا چکے ہیں۔ لاتعداد آہوں کا خراج دے چکے ہیں۔ ان کی موت کے بعد ان پر نوحہ خوانی کی جا چکی ہے۔ اور ہزاروں حسرت انجام کہانیاں کئی کئی دفعہ دہرائی جا چکی ہیں۔

ازبیلا کی زندگی شدید مصائب سے لبریز تھی۔ اور لورینزو کی حنوط شدہ لاش درختوں کے حرارت بیز جھنڈ میں پڑی رہی تھی۔ پھر بھی یہ حقیقت بدستور قائم ہے کہ محبت کی سلطنت میں وقتی مسرت لاتعداد مصائب پر بھی حاوی آجاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ شہد کی مکھیاں خدائے بہار کے دروازے کی بھنکاریں خوب سمجھتی ہیں کہ زہریلے پھولوں میں سب سے زیادہ شہد ہوتا ہے۔

یہ حسین دوشیزہ اپنے بھائیوں کے پاس رہتی تھی۔ جو باپ دادا کی بے شمار دولت

کے مالک تھے۔ اور جن کی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے چھریاں پڑے ہانتھ چراغوں کی روشنی سے منوّر کانوں اور کارخانوں میں آبلہ پوش ہو جاتے تھے۔ اور وہ رانیں جو گوشت کی وجہ سے تھرکتی رہتی تھیں جانگداز کوڑوں سے خون بن کر بہ جاتیں ــــ ان کے لئے لاکھوں نیم مُردہ انسان چمکتے ہوئے دریا میں صبح سے شام تک کھڑے رہتے اور زر و جواہر سے بھری ہوئی کشتیاں کنارے لگاتے رہتے۔

انہیں کے لئے سیلن کے ملّاح نے اپنا سانس روک لیا۔ اور عریاں جسم کے ساتھ بھوکی شارک کے مُنہ میں کُود پڑا۔ انہیں کے لئے کمزور انسانی قوتیں موت کے مہیب جبڑوں میں پس کر فنا ہو گئیں محض انہیں کے لئے لاتعداد انسان شدید مصائب کی وادیوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ اور یہ بے اعتنائی سے تقدیر کا پہیّہ پھیر دیتے۔ جس سے مزدور کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا جاتا۔

وہ کیوں مغرور تھے؟ کیا اس لئے کہ ان کے مرمریں فوارے ایک غم نصیب ہستی کی آنکھوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ قطرے لٹاتے تھے؟ وہ کیوں مغرور تھے؟ کیا اس لئے کہ زندگی کی پہاڑیوں پر چڑھنا ایک کوڑھی کے سیڑھیوں پر چڑھنے سے زیادہ آسان تھا؟ وہ کیوں مغرور تھے؟ کیا اس لئے کہ سُرخ لکیروں والے بہی کھاتے روما کے سنہری زمانے کی شاعری سے زیادہ وجد انگیز اور کیف بار تھے؟ امارت کی شوکت وسطوت کا صدقہ ہمیں بتاؤ کہ وہ کیوں مغرور تھے؟

فلارنس کے یہ دونوں فرزندان دو کٹّر یہودیوں کی طرح مغرور اور خود پسند ہو گئے تھے۔ جو اس سرزمین شعر و رومان میں رہنے کے باوجود چاندی اور سونے میں گھرا رہنے کی وجہ سے زرد رُو ہو گئے تھے۔ اور جو فقرا کو جاسوس سمجھ کر ان سے ڈر جایا کرتے

تھے۔

بہی کھاتے کے خشک اوراق میں ڈوبے ہوئے ایسے غیر شاعر لوگوں نے کس طرح حسین اربیلا کو شفق کی رنگین دنیا میں دیکھ لیا۔ کیونکہ وہ لورینزو کی نظروں میں کام سے جی چرانے کا جذبہ بھانپ گئے۔ کس طرح مصر کا یہ گرم مزاج فرزند کاہل اور سست نظر آنے لگا؟ تاہم وہ سب کچھ سمجھ گئے۔ سوداگر بھی کبھی شکار شدہ ہرن کی طرح پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا ہے۔

جب ہزاروں اشاروں سے ان لوگوں کو لورینزو کی محبت کا یقین ہو گیا۔ اور انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان کی بہن بھی اسے محبت کرتی ہے تو ان دونوں نے ایک دوسرے سے اپنے خوفناک خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ آخر لورینزو ان کا غلام کس طرح ان کی ہمشیر سے محبت کی رنگ رلیوں میں مشغول رہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ اربیلا کسی نواب کی بیوی بنے۔ اور اس کی وساطت سے اس نواب کے زیتون کے درختوں سے فائدہ اٹھانے کی سبیل نکل آئے۔

جب وہ اکٹھے بیٹھتے تو ان کے حسد کی چنگاریاں بھڑک اٹھتیں۔ جب وہ تنہا ہوتے تو ہونٹ چباتے رہتے۔ آخر کچھ دنوں کے غور و فکر کے بعد انہوں نے ایک تجویز سوچ لی جس سے اس بے وقوف نوجوان کو اس کی غلطی کی سزا دینے کا راستہ پیدا ہو گیا مٹی کے ان سفاک پتلوں نے رحم و کرم کے جگر میں آتشیں خنجر بھونک دیئے یعنی انہوں نے لورینزو کو قتل کر کے گھنے اور تاریک جنگل کی ناقابل عبور گہرائیوں میں دفن کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ایک خوشگوار صبح کو جب لورینزو باغ کے پل پر جھکا ہوا آفتاب کی ابھرتی کرنوں میں نہا رہا تھا۔ یہ لوگ شبنم کو اپنے سفاک پاؤں تلے روندتے ہوئے اس کی طرف

بڑھے اور بولے" ہمیں افسوس ہے کہ ہم تمہارے اس سکون میں مخل ہوتے ہیں۔ لیکن عقلمندی اسی میں ہے کہ ایسے ٹھنڈے وقت میں گھوڑے پر زین کس لی جائے ـــــ آج ـــــ نہیں ـــــ اسی وقت ہم اپنشیا ان کی طرف جائیں گے۔ اس لئے اس سے پہلے کہ شبنم کے بکھرے ہوئے موتی آفتاب کے طلائی دامن میں سمٹ جائیں، نیچے اُتر آؤ۔"

لورینزو نے حسب عادت بڑی خندہ پیشانی سے ناگن کے ان زہریلے بچوں کا استقبال کیا۔ اور جلدی جلدی بیلٹ، نیزہ اور شکار کے دیگر سامان سے مسلح ہونے اندر چلا گیا۔

صحن میں سے گزرتے وقت وہ ہر قدم پر ٹھہر تا، تا کہ اگر اس کے دل کی ملکہ مصروف نغمہ طرازی ہو تو مترنم آواز اس کی سماعت میں محفوظ ہو جائے۔ یا کم از کم ان ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دے دے۔ وہ اسی طرح اپنے جذبات کی فضاؤں میں اڑتا ہوا جا رہا تھا کہ اوپر کی منزل میں ایک نقرئی قہقہہ گونجا ـــــ ایک ترنم ریز و موسیقی زا قہقہہ! اس نے اوپر دیکھا۔ ازبیلا کا دمکتا ہوا چہرہ اپنے عفت مآب دامن میں مسکراہٹوں کی جنتیں سمیٹے دریچے کے رخنے میں سے جھانک رہا تھا۔

"پیاری ازبیلا!" اس نے کہا۔" مجھے خوف تھا کہ کہیں تمہیں صبح بخیر کہنے کی سعادت سے بھی محروم نہ کر دیا جاؤں آہ! گو ہیں گھنٹوں کے قلیل وقفے کی جدائی قلب و جگر کو غم و اضطرار کی چکی میں پیس سکتی ہے تو تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا کس قدر جاں سوز ہو گا۔ لیکن فکر مت کرو ہم بھی روز روشن کی طرح جدائی کی بھیانک تاریکیوں میں نہا کر اور زیادہ نورانی ہو جائیں گے۔ خدا حافظ پیاری میں جلد آجاؤں گا"

ازبیلا نے کہا "خدا حافظ" اور جب لورنیزو جانے کے لئے مڑا تو ازبیلا کے ہونٹوں پر ایک وجد آور نغمہ تھرک رہا تھا۔

اس طرح دونوں بھائی اور بدنصیب محب فلارنس کی حسین وادیوں میں سے ہوتے ہوئے اس طرف چل دیئے۔ جہاں آرنو ندی اپنی اٹھکیلیوں سے ترنم کے دریا بہاتی لہروں کی مقراض سے کائی کو کاٹتی سیدھے کناروں میں سے ہوتی ہوئی گذرتی ہے۔ دونوں بھائیوں کے گھبراتے ہوئے چہرے یکسر زرد ہو گئے تھے۔ لیکن لورنیزو کے چہرے پر پاک محبّت کا لافانی نور کھیل رہا تھا۔ وہ اس ندی پر سے گذر کر ایک بھیانک جنگل میں پہنچ گئے جس کی ہمہ گیر خاموشی خوفناک کارروائیوں کے لئے موزوں تھی۔

اسی جگہ لورنیزو کو قتل کر کے دفن کر دیا گیا۔ آہ! اس جنگل کی تاریک وسعتوں میں محبّت کے ایک عظیم الشان شعلے کو بجھا دیا گیا۔ افسوس! جب رُوح اس طریقے سے عناصر کی قید سے آزاد کر دی جائے تو وہ گناہ کے شکاری کتّے کی طرح بے قرار ہو جاتی ہے۔ ان قاتلوں نے اپنی تلواروں کو ندی کے پانی سے دھولیا اور گھوڑوں کے پہلوؤں کو اپنی گھبرائی ہوئی ایڑوں سے زخمی کرتے ہوئے گھر کی طرف چل دیئے۔ دونوں قتل کے نشے میں سرشار تھے۔

گھر پہنچ کر انہوں نے اپنی بہن کو بتایا کہ لورنیزو کو کسی ضروری کام کی وجہ سے یکایک جہاز پر سوار ہو کر غیر ممالک میں جانا پڑا ہے۔ بدنصیب لڑکی بیوگی کا لباس پہن لے۔ اور خدائے اُمید کے بے درد پنجوں سے دور بھاگ جا۔ آج سے تو اُسے نہ دیکھ سکے گی اور نہ کل۔ وہ تیری طرف دیکھ کر مُسکرائے گا۔ اور پرسوں کا دن تیرے

لئے آنسوؤں اور سسکیوں کا دن ہوگا۔

وہ اس خوشی کے لئے آنسو بہا رہی ہے۔ جو اسے کبھی بھی حاصل نہ ہوگی۔ وہ روتی رہی۔ یہاں تک کہ شام کے دھندلکے نے دنیا کو اپنے سائے میں لے لیا۔ اور پھر —— آہ! وہ محبت کے پھولوں پر سونے کی بجائے فراوانیٔ دولت کے طلائی کانٹوں پر تڑپتی رہی۔

اس کی نگاہیں شام کی بڑھتی ہوئی تاریکیوں میں اپنے محبوب کا سراپا دیکھتی رہیں۔ بار بار ایک ہلکی آہ اس کے ہونٹوں تک آکر دم توڑ دیتی۔ وہ اپنے حسین اور متناسب بازو ہوا میں پھیلاتی اور اپنے بستر پر لیٹ کر زیر لب کہتی "تم کہاں ہو آہ کہاں ہو؟"

جس طرح خزاں کے وسطی زمانے میں دور سے سرما کی خوفناک پھنکاریں سنائی دینے لگتی ہیں اور دلگیر مشرق سنہری تاروں سے ایک مسلسل کھیل میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اور جھاڑیوں اور پتوں میں موت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگتا ہے تاکہ اپنے مشرقی غار سے نکلنے سے پہلے عریاں ہو جائے۔ اسی طرح حسین ازبیلا آہستہ آہستہ حُسن کی بلندیوں سے گرتی گئی۔

کیونکہ لورنیزو واپس نہیں آیا تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنی زرد آنکھوں کو قابو میں رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اپنے بھائیوں سے پوچھتی کہ لورنیزو کو کونسا ایسا کام تھا جس نے اسے اتنی دیر تک غیر ملک میں روک رکھا ہے۔ اور وہ اسے خاموش کرنے کے لئے ایک فرضی قصّہ سنا دیتے۔ لیکن ان کا تاریک گناہ کثیف دھوئیں کی طرح ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر مسلّط ہو چکا تھا۔ اور وہ رات کو سوتے وقت اپنی بہن کو برفانی کفن میں لپٹا ہوا دیکھ کر چیخ اُٹھتے۔

وہ اس نشہ آور بے خودی سے مر گئی ہوتی لیکن ظالم تقدیر نے اسے دُنیا کی خوفناک ترین چیز کے دیکھنے کے لئے زندہ رکھا۔ یہ چیز اس دوا کے ایک ایسے گھونٹ کی طرح تھی۔ جو موت کی سسکیاں لیتے ہوئے بیمار کو چند لمحوں کے بعد کفن کی خوفناک چادر میں لپیٹ لے۔ ایک بے درد بھالے کی طرح جو دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں سوتے ہوئے "ریڈ انڈین" کو ایک بے پناہ چبھن کے ساتھ بیدار کر دے۔ اور اسے ذہنی کرب کا احساس کرا دے۔

یہ ایک خواب تھا —— آدھی رات کی بھیانک تاریکیوں میں اس نے دیکھا کہ لورنیز واس کی چارپائی کی پائنتی پہ کھڑا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا لگ رہی ہے۔ جنگلی قبر کی خوفناک افسردگی نے اس کے بالوں کی وہ چمک دمک چھین لی تھی۔ جو کبھی سورج کی آنکھ کو منور کر دیتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پہ موت کی سرد مہر ثبت ہو چکی تھی۔ اس کی آواز کا ترنم لٹ گیا تھا۔ اور اس کے خوبصورت گوشوارے آنسوؤں کی وجہ سے دلدل معلوم ہونے لگے تھے۔

جب زرد افسردہ سائے نے بولنے کے لئے زبان کھولی۔ تو ازبیلا کو اس کی آواز میں اجنبیت سی محسوس ہونے لگی۔ اس کی رقت خیز آواز زندگی کی روانی اور مٹھاس کو واپس لانے کی بے سود کوشش میں مصروف تھی۔ ازبیلا اس آواز کے ترنم کو دوبارہ سُننا چاہتی تھی۔ اس آواز میں رعشہ زدہ ڈر دو کے بربط کے شکستہ تاروں کی دردانگیز کپکپاہٹ پنہاں تھی۔ اس میں سے ایک بڑا ہی دھیما ترنم سنائی دیا۔ جو آدھی رات کے وقت آتش فشاں پہاڑ کے شعلوں میں سے گذرنے والے تیز ہوا کے جھونکوں کی آواز سے مشابہ تھی۔

اس کی آنکھیں اگرچہ دہشت ناک تھیں۔ تاہم ان میں محبّت کی چمک ابھی تک مستور تھی۔ اسی سحر آفریں چمک نے اس ننھی بدنصیب لڑکی کو خوف وہراس کے پنجوں سے بچالیا۔ اور زیزو کی روح تاریک ماضی پر سے خوفناک پردے اٹھاتی رہی غرور ونخوت کے قاتلانہ عزائم جنگل کی تاریک چھت ——— اور مٹی کی سرد غار ——— جہاں اس نے ایک لفظ کہے بغیر اپنے آپ کو خونی برچھوں کے حوالے کر دیا تھا۔

اس نے یہ بھی کہا "میری پیاری ازبیلا! میرے سرہانے سُرخ جنگلی بیر ہیں۔ اور میری پائینتی پر بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے ہیں۔ میرے اردگرد جھنٹوں کے درخت سوکھے پتّوں اور خار دار پھلوں کی بارش کرتے ہیں۔ بھیڑوں کے ریوڑ کے چلنے کی آواز دریا کے اس پار سے میری آرامگاہ تک آتی ہے۔ آؤ اور میری سونی قبر پر ایک آنسو بہا جاؤ۔ تمہارا یہ آنسو میری موت کی ساری تلخیاں دور کر دے گا۔

"اب میں ایک سایہ بن گیا ہوں۔ افسوس افسوس! اور انسانی فطرت کے بعید ترین گوشوں میں تنہا ہوں۔ میرے اردگرد زندہ انسانوں کی دھیمی آوازیں بند ہو جاتی ہیں۔ اور میں تنہا مقدس گیت گاتا ہوں۔ شہد کی چمکدار مکھیاں بھنبھناتی ہوئی مرغزاروں کی طرف جاتی ہیں۔ اور بے شمار گرجوں کی مترنم آوازیں زندگی کی یاد کو تازہ کر کے میرے سینے میں بھالے بھونک دیتی ہیں۔ اب یہ سب آوازیں میرے لئے غیر مانوس ہو جاتی ہیں۔ اور تم مجھ سے بہت دور زندگی کی رنگیں وادیوں میں رہتی ہو۔

میں جانتا ہوں کہ ماضی میں کیا ہوا تھا۔ اور حال بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اگر روحیں غصّے سے دیوانی ہو سکتی ہیں تو میں بھی بہت جلد پاگل ہو جاؤں گا

باوجودیکہ میں زندگی کے لذیذ کو بھولتا جارہا ہوں۔ تاہم تمہارے چہرے کی یہ افسردگی میری قبر کو اس طرح منور کر دیتی ہے۔ گویا نورانی سمندر کا کوئی طلسمی ہیرا میرے پاس ہو۔ تمہارے چہرے کی زردی میرے دل ودماغ کو مسرت کے لافانی نور سے بھر دیتی ہے۔ تمہارا حسن میری رگ رگ پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اور ہمیشہ پیوست ہوئی جاتی ہے۔

رُوح نے ایک دلدوز آہ بھر کر کہا۔ "الوداع! جس طرح پرانے لاہم زمانہ اور سعی نامشکور کا خیال ہماری جوانی کی راتوں سے نیند چھین کر ہمیں موسیقی کے زیروبم میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور پُرکیف دھندلکا پیچ وتاب کھانے لگتا ہے۔ اسی طرح روح بھی تحلیل ہو گئی۔ اور تاریک فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش چھوڑ کر غائب ہو گئی۔ مغموم ارمیلا کی آنکھوں میں درد ہونے لگا۔ اور وہ پو پھٹنے تک تارے گنتی رہی۔

"ہاہا" اس نے کہا۔" میں زندگی کے ان شدائد سے ناآشنا تھی میرا خیال تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا دکھ معمولی سی خلش سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتی تھی کہ قسامِ ازل نے کسی خوشی کے وقت یا اپنی مخالف قوتوں سے لڑتے وقت جوش میں آ کر ہم دونوں کو مسرت کا بہترین حصہ بخشا ہے لیکن مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ اس دنیا میں جدائی بھی ایک بھائی خونچکاں خنجر بھی ہے! عزیز روح! تم نے میری معصومیت کو چالاکی میں بدل دیا ہے میں آؤں گی۔ تمہاری آنکھوں پر بے شمار بوسوں کی بارش کروں گی۔ اور صبح شام آسمان کی بلندیوں پر تیرا استقبال کیا کروں گی"۔

پو پھٹنے سے پہلے اس نے پوشیدہ طور پر اسی جنگل میں جانے کا طریقہ سوچ لیا۔ اس نے یہ بھی سوچ لیا کہ کس طرح وہ عزیز ترین مٹی ڈھونڈھ لے گی۔ ان ذروں کو کس طرح میٹھی لوریاں سنائے گی۔ اور پھر جب اس خواب کی تعبیر اس کی آنکھوں کے

ایسا محسوس کرنے لگی ہوں کہ جیسے فولادی غباروں کی طرح میرے [illegible] میں

سامنے آجائے گی تو لینو کر۔ اس کی یہ مختصر غیر حاضری معاف کر دی جائے گی۔ یہ سوچ کر اس نے ایک بوڑھی آیا کو ساتھ لیا۔ اور اس گھنے تاریک جنگل کی طرف چل دی۔

دیکھئے وہ ندی کے کنارے کنارے چلتے ہوئے کس طرح بوڑھیا کے کانوں میں ہولے ہولے باتیں کرتی ہے۔ اور پھر کس طرح سہمی ہوئی آنکھوں کے ساتھ چاروں طرف دیکھ کر اسے ایک خنجر دکھاتی ہے۔ "بیٹا یہ کیسا کافرانہ شعلہ تیرے سینے میں بھڑک رہا ہے ——— یہ تمہارا بار بار مسکرانا کیسی خوشی کا آئینہ دار ہے۔ شام تک انہوں نے لورنیزو کی خاکی آرام گاہ کو ڈھونڈھ نکالا۔ پتھر کے ٹکڑے بھی وہیں تھے اور سُرخ جنگلی بیر بھی!

کون ایسا متنفس ہے جو سر سبز قبرستان میں نہیں گیا۔ اور جس کا تصور ایک عظیم الجثہ چھچھوندر کی طرح مٹی کے ڈھیروں اور سنگین پردوں میں سے گذرتا ہوا کھوپری کی سوختہ استخوان اور کفن میں لپٹی ہوئی گلی سڑی ہڈیوں کو دیکھنے کے لئے قبر کے اندر نہیں پہنچا اور پھر موت کے منحوس سائے تلے آکر بگڑی ہوئی صورتوں کو ترحم خیز نظروں سے دیکھ کر انہیں دوبارہ زندگی و روح سے آشنا کرنے کے لئے بے چین نہیں ہو گیا۔ لیکن یہ سب بے چینی اور حسرت اس جذبہ کرب کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہے۔ جو ازبیلا نے لورنیزو کے قریب وہ زانو ہوتے وقت محسوس کیا۔

اس نے تازہ کھدی ہوئی مٹی کی طرف دیکھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی نظر میں سارے راز طشت ازبام ہو گئے ہیں جس طرح لگاہیں کنوئیں کے شفاف پانی کی تہ میں سب کچھ دیکھ لیتی ہیں۔ اسی طرح ازبیلا نے بھی قبر کی گہرائیوں میں دبے ہوئے زرد اعضا کو صاف دیکھ لیا۔ وہ اس خونی مقام پر کھڑی ہوئی کسی خشک جھیل کا مرجھایا ہوا کنول نظر آتی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے کھڑی رہی۔ پھر دفعتاً

جھکی۔ اور بے پناہ سرعت سے زمین کھودنے لگی۔

جلد ہی اس مٹی میں سے ایک دستہ دار دستانہ برآمد ہوا جس پر ازبیلا کے اپنے ہاتھوں سے سُرخ ڈورے سے مختلف نقوش کڑھے ہوئے تھے۔ ازبیلا نے سنگِ مرمر سے زیادہ سرد ہونٹوں کے ساتھ اُسے چُوم کر اپنے سینے کے پاس رکھ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ بچے کو بہلانے کا یہ معمولی کھلونا اب سرد ہوکر ہڈیوں میں جم گیا ہے۔ لیکن پھر بھی ازبیلا اپنے کام میں مشغول رہی اور بکھری ہوئی زلفوں کو ماتھے پر سے ہٹانے کے سوا وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہ رُکی۔

بوڑھی آیا دیر تک قریب کھڑی دیکھتی رہی۔ آخر اس کا دل اس رُوح خراش منظر کو دیکھ دیکھ کر پانی پانی ہو گیا۔ اور اس نے بھی اپنے برف جیسے سفید بالوں کے ساتھ جھک کر اس دہشت ناک کام میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ آخر تین گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد قبر کا نچلا حصہ برآمد ہوا۔ کس قدر خوفناک منظر تھا لیکن ازبیلا کی آنکھوں میں اب بھی کوئی آنسو نہیں تھا۔

سرسین کی تلوار سے بھی زیادہ کند آرے کے ساتھ ان لوگوں نے کسی غیر انسانی مخلوق کا سر نہیں کاٹا تھا۔ بلکہ یہ سر تھا۔ ایک ایسے شخص کا جو موت کے بعد بھی اسی طرح حلیم الطبع معلوم ہو رہا تھا۔ جس طرح وہ زندگی میں تھا۔ پرانے زمانے کے شعرا کا قول ہے کہ محبت کبھی نہیں مرتی۔ بلکہ یہ لافانی شہزادی ابدالآباد تک زندہ رہتی ہے۔ لیکن اگر محبت کا مجسمہ موت کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو بھی سکتا ہے تو ازبیلا انہیں ٹکڑوں پر بوسوں کی بارش کرتی رہی۔ اور سہمے ہوئے آہیں بھرتی رہی۔ یہ محبت کا دیوتا تھا۔ سرد مردہ۔ لیکن اب بھی اس کی حکومت دل پر تھی۔

وہ اسے پوشیدہ طور پر لے گئی اور یہ بیش بہا خزانہ ازبیلا کے لئے وقف ہوگیا۔ اس نے طلائی کنگھی سے اس کے ایستادہ بالوں کو سنوارا۔ آنکھوں کے سیاہ حلقوں کے ارد گرد نوکیلی پلکیں تیروں کی طرح تن کر کھڑی ہوگئیں۔ بہتے ہوئے دھارے کی طرح ٹھنڈے آنسوؤں سے اس نے کٹی ہوئی گردن پر چپکے ہوئے گوشت کے بدنما لوتھڑوں کو صاف کر دیا۔ وہ ہر لحظہ ان بالوں میں کنگھی کرتی اور آہیں بھرتی —— وہ ہر لحظہ اس پر بوسوں کی بارش کرتی اور آنسو بہاتی۔

پھر اس نے اس سر کو ایک ریشمی رومال میں لپیٹ دیا۔ جواہر کی کے خوشبودار پھولوں کے مشام نواز عطر میں بسایا گیا تھا۔ ازبیلا نے اس محترم سر کو ایک پیالے میں رکھ دیا اور اسے باغ کے ایک گوشے میں دفن کر دیا۔ اس میں اس نے ریحان کے نزہت بیز پھول لگائے۔ جو اس کے آنسوؤں سے ہمیشہ تر رہتے تھے۔

چاند سورج ستاروں کا خیال بھی اس کے ذہن سے مٹ گیا۔ ہرے درختوں کی جھومتی ہوئی ٹہنیوں پر جھکا ہوا نیلگوں آسمان اس کے دماغ سے محو ہوگیا۔ وہ پانی سے بھری ہوئی شفاف جھیلوں کو بھول گئی۔ اور موسم خزاں کی سرد ہواؤں کی تندی اور تیزی اس کے لئے بے معنی ہوگئی۔ لیکن ریحان کے خوشبودار پھول ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہتے۔ وہ انہیں اپنے آنسوؤں سے سیراب کرتی رہتی۔

کئی دن گزر گئے۔ اور وہ برابر اس نازک پودے کو اپنے نازک آنسوؤں سے سینچتی رہی۔ یہاں تک کہ یہ پودا خوب بڑھ پھول کر تر و تازہ ہوگیا۔ یہ پھول اتنے خوبصورت اور خوشبودار تھے کہ فلارنس بھر میں ان کا مثل ملنا ناممکن تھا۔ کیونکہ یہ پھول خوراک حاصل کرتے تھے انسانی خون سے اور ایک انسان کا فنا ہوتا ہوا سر کھاد کی طرح استعمال ہو رہا تھا۔

الغرض یہ قیمتی ہیرا عنبر بانو دل کی صورت میں پھوٹ پڑا۔

اے ... کے دیوتا! چند لمحوں کے لئے ٹھہر جا موسیقی — موسیقی ملال کی آہیں ذرا
اے آہ کی دیوی! اے حزن و ملال کے شیطان! اپنے سر اٹھاؤ اور مسکراؤ۔ اپنے افسردہ سر اٹھاؤ
اور اپنے خوفناک دھندلکے میں زرد روشنی کے دھبے بکھیر دو تاکہ تمہارے افسردہ زار
لرزتی روشنی کے دھندلے افزا دھبوں کے سایوں میں آ جائیں

اے افسردگی کی انوکھی مخزون سہیلیاں کی گلے کی آہیں بن کر نکلو ابد تک بربط کے المناک تاروں
پر تھرکتا اور اس کی موسیقی میں اسرار کی شراب ... کیونکہ وہ دل ازبیلا جلد ... عالم موت
کے گہرے جزیروں میں جانے والی ہے۔ وہ ایک ایسے مجبور زندگی ... مرجھا رہی ہے جس کو کسی
ظالم نے اس کے خوشبودار شہد کے لئے کاٹ دیا ہو ظالم نے اس کے خوشبودار شہد
آہ! چند روز تک ... اس کو مرجھا کر سوکھ جانے کے ... اور ... کے وقت کا سلسلہ
سرد ... کر دینے والی تندی کو اس کے قریب نہ آنے دیجئے۔ اس کے ... اور
کے کونے ... مردہ آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے مسلسل تار کو دیکھ لیا۔
اس کے رشتہ داروں میں سے چند متجسس عفریت حیرت میں تھے کہ حسن و جوانی کا ایسا
مرکز ایک نوبیاہی ہونے والی بیوی کے ہاتھوں یوں مٹی میں مل رہا ہے۔

اس کے ساتھیوں کو یہ حیرت تھی کہ وہ کیوں ریحان کے پودے کے قریب جھکی رہتی ہے
اور کیوں یہ پودے اس سرعت سے بڑھ رہے ہیں کہ ان پر جادو کے پھولوں کا گمان ہونے لگتا
ہے۔ یہ عجیب و غریب باتیں ان کی سمجھ سے کوسوں دور تھیں انہیں کسی طرح بھی یقین
نہیں آ سکتا تھا۔ ریحان کا یہ حقیر جام ازبیلا کو اپنی حسین جوانی اور مسرت سے چھلکتی
ہوئی عمر بلکہ گذشتہ محبت تک کو بھلا دینے کی قوت رکھتا ہے۔

اس لئے وہ اس راز کو طشت از بام کرنے پر تل گئے۔ وہ دیر تک کسی موزوں موقعہ کی بے سود جستجو کرتے رہے۔ کیونکہ ازبیلا ہر وقت پودے کے قریب بیٹھی رہتی تھی نہ ہی وہ گرجے میں جاتی اور نہ ہی بھول کر وہاں کی مہوسیاں اُسے اس جام سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوئیں ——— اگر وہ کہیں جاتی تو اس پرند کی طرح جو اپنے انڈوں کو واپس آنے کے لئے بے قرار ہو فوراً واپس چلی آتی۔ وہ مرغی کے صبر و سکون کے ساتھ ریحان کے پھولوں کے قریب بیٹھی اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا برساتی رہی۔

لیکن اس حفاظت کے باوجود ان ظالموں نے جامِ ریحان چرا کر اسے کسی خفیہ مقام پر لے جانے کا انتظام کر لیا۔ پیالے کے اندر رکھی ہوئی چیز گو کائی کی سبزی اور زرد دھبوں سے ناقابلِ شناخت ہو چکی تھی تاہم انکی نظر پڑ گئیں کہ یہ لورینزو کا سر ہے انہیں قتل کا سراغ مل گیا۔ اس لئے وہ اسے ساتھ لے کر فلارنس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ وہ ایک بے گناہ کے قتل کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے غریب الوطنی کی ٹھوکریں کھانے کے لئے فلارنس سے نکل گئے۔

اے حزن کے دیوتا! آنکھیں پھیر لے۔ اس طرف سے موسیقی! موسیقی!! المیہ نغمے الاپ۔ افسردگی کے شیطانو! "الوداع" نہ گاؤ۔ کیونکہ ازبیلا حسین ازبیلا ایک ٹوٹی ہی غیر مکمل موت مرے گی۔ یہ ظالم اس سے جامِ ریحان بھی چھین کر لے گئے ہیں۔

وہ مردہ اور بے رُوح چیزوں کی طرف ترحم خیز نظروں سے دیکھتی اور اپنے گم شدہ جامِ ریحان کا پتہ پوچھتی وہ اپنی آواز کے الم انگیز تاروں پر گاتی اور آوارہ راہب سے پوچھتی کہ اس کا جامِ ریحان کہاں ہے۔ اور وہ کیوں اس کی نظروں سے چھپا دیا گیا ہے؟ "کس قدر ظلم ہے!" وہ کہتی ہے "میرا جامِ ریحان بھی مجھ سے چھین لیا گیا!"

[illegible] خوشی [illegible] ریحان مانگتی زیب تن [illegible] کر رکھی۔ [illegible] اپنی مشتعل لیا۔
[illegible] حسن سے اس کی جنت کی [illegible] پر آنسو بہاتے ہوں۔ اس کی کہانی کی افسردہ پری
لوگوں کی [illegible] ہمارے ساز [illegible] چھپائی۔ اب تک گا۔ [illegible] یہ گیت سنا جاتا
[illegible] آہ! یہ کتنا ظلم ہے۔ میرا جام ریحان بھی مجھ سے چھین لیا گیا۔"

([illegible] محمد حنیف پرنٹر پبلشر [illegible] لاہور میں چھپوا کر [illegible] شائع کیا)